اس شمارے میں

حرفِ اوّل

بچاؤ کا راستہ — حافظ عاطف وحید — 2

مطالعہ قرآن حکیم

سورۃ البقرۃ (آیات ۱۴۲ تا ۱۵۲) — ڈاکٹر اسرار احمد — 3

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح — لطف الرحمٰن خان — 15

حکمت نبوی ﷺ

ہمسائیگی کے بعض متعین حقوق — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 27

افاداتِ ابن قیمؒ

گناہ اور ہماری زندگی پر اس کے اثرات — سعدیہ خاور — 31

علوم القرآن

حقیقت ومجازِ قرآن (۱) — حافظ محمد زبیر — 37

علوم القرآن

نظم ومناسباتِ قرآن — جواد حیدر — 47

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرۃ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

بیاد گار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:

حافظ عاطف وحید ۔ حافظ محمد زبیر

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی ۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ ۔ اپریل ۲۰۰۷ء شمارہ ۴

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ فون 3-5869501

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے ۔ فی شمارہ: 10 روپے

بھارت 700 روپے ۔ ایشیا، یورپ، افریقہ 1100 روپے ۔ امریکہ، آسٹریلیا 1400 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچاؤ کا راستہ

سورۃ القصص کی آیت ۵۶ میں اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے: ''تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔ سورۃ یوسف کی آیت ۱۰۳ میں فرمایا: ''اور خواہ تم کتنا ہی چاہو اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں''۔ اسی طرح سورۃ النحل کی آیت ۳۷ میں ارشاد ہوا: ''اگر تم ان (معاندینِ حق) کی ہدایت کے متمنی ہو تو جان رکھو کہ اللہ راہیاب نہیں کرتا اُن لوگوں کو جن کو وہ گمراہ کر دیتا ہے (یعنی جو گمراہی کو اپنے حق میں قبول کر لیں تو پھر اللہ بھی ان کی گمراہی پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے) اور ایسوں کا کوئی مددگار نہیں''۔

حق کی حمیت میں بعض اوقات داعیانِ حق ایسی راہوں کا انتخاب کر لیتے ہیں جو نہ تو خارجی ظروف و احوال کی مناسبت سے محمود ہوتی ہیں اور نہ ہی احقاقِ حق کی ذمہ داری کی نسبت سے مطلوب ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس بات کا خیال نہیں رہتا کہ داعیٔ حق کو اس کے داعیانہ کردار کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ اور ترغیب و تشویق سے زیادہ کسی چیز کا اختیار نہیں بخشا۔ حتیٰ کہ انبیاء و رُسل کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کے دل میں زبردستی ہدایت ڈال دیں۔ ہدایت یا گمراہی کو اختیار کرنا انسان کی اپنی پسند اور اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق و تیسیر پر منحصر ہے۔ متذکرہ بالا آیات دراصل اسی نوع کی فکری ہدایت پر مشتمل ہیں۔

انہی مبادیات کی روشنی میں جملہ انبیاء و رُسل بشمول خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ سے لے کر ﴿كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ .....﴾ اور ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے اور اُمت کے لیے انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں اسوۂ حسنہ کی صورت میں ایسے بیش قیمت سنگ ہائے میل متعین کرتے رہے جن سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

(باقی صفحہ 26 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۱۴۲ تا ۱۵۲

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَىِٕنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۙ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝

دو رکوعوں پر مشتمل تمہید کے بعد اب تحویل قبلہ کا مضمون براہِ راست آ رہا ہے' جو پورے دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کون سی ایسی بڑی بات تھی جس کے لیے قرآن مجید میں اتنے شد و مد کے ساتھ اور اس قدر تفصیل بلکہ تکرار کے ساتھ بات کی گئی ہے؟ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک خاص مذہبی ذہنیت ہوتی ہے' جس کے حامل لوگوں کی توجہ اعمال کے ظاہر پر زیادہ مرکوز ہو جاتی ہے اور اعمال کی روح ان کی توجہ کا مرکز نہیں بنتی۔ عوام الناس کا معاملہ بالعموم یہی ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں اصل اہمیت دین کے ظواہر اور مراسمِ عبودیت کو حاصل ہو جاتی ہے اور جو اصل روحِ دین ہے' جو مقاصدِ دین ہیں' ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ نتیجتاً ظواہر میں ذرا سا فرق بھی انہیں بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کی مثال یوں سامنے آتی ہے کہ احناف کی مسجد میں اگر کسی نے رفع یدین کر لیا یا کسی نے آمین ذرا اونچی آواز میں کہہ دیا تو گویا قیامت آ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہماری مسجد میں کوئی اور ہی آ گیا۔ اس مذہبی ذہنیت کے پس منظر میں یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں تھا۔

اس کے علاوہ یہ مسئلہ قبائلی اور قومی پس منظر کے حوالے سے بھی سمجھنا چاہیے۔ مکہ مکرمہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے ظاہر ہے ان سب کو خانہ کعبہ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ خود نبی اکرم ﷺ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی تو آپؐ روتے ہوئے وہاں سے نکلے تھے اور آپؐ نے

فرمایا تھا کہ اے کعبہ! مجھے تجھ سے بڑی محبت ہے' لیکن تیرے یہاں کے رہنے والے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک آپ مکہ میں تھے تو آپ کعبہ کی جنوبی دیوار کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوتے۔ یوں آپ کا رُخ شمال کی طرف ہوتا' کعبہ آپ کے سامنے ہوتا اور اس کی سیدھ میں بیت المقدس بھی آ جاتا۔ اس طرح ''استقبال القبلتین'' کا اہتمام ہو جاتا۔ لیکن مدینہ میں آ کر آپ نے رُخ بدل دیا اور بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ یہاں ''استقبال القبلتین'' ممکن نہ تھا' اس لیے کہ یروشلم مدینہ منورہ کے شمال میں ہے' جبکہ مکہ مکرمہ جنوب میں ہے۔ اب اگر خانہ کعبہ کی طرف رُخ کریں گے تو یروشلم کی طرف پیٹھ ہوگی اور یروشلم کی طرف رُخ کریں گے تو کعبہ کی طرف پیٹھ ہوگی۔ چنانچہ اب اہل ایمان کا امتحان ہو گیا کہ آیا وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی پیروی کرتے ہیں یا اپنی پرانی عقیدتوں اور پرانی روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جو لوگ مکہ مکرمہ سے آئے تھے ان کی اتنی تربیت ہو چکی تھی کہ ان میں سے کسی کے لیے یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ بقول اقبال:۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

حالانکہ قرآن مجید میں کہیں منقول نہیں ہے کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ حکم وحیٔ خفی کے ذریعے سے دیا گیا ہو' تاہم وحی جلی میں یہ حکم کہیں نہیں ہے کہ اب یروشلم کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیے۔ یہ مسلمانوں کا اتباعِ رسولؐ کے حوالے سے ایک امتحان تھا جس میں وہ سرخرو ہوئے۔ پھر جب یہ حکم آیا کہ اپنے رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو تو یہ اب اُن مسلمانوں کا امتحان تھا جو مدینہ کے رہنے والے تھے۔ اس لیے کہ ان میں سے بعض یہودیت ترک کر کے ایمان لائے تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ علماءِ یہود میں سے تھے' لیکن جو اور دوسرے لوگ تھے وہ بھی علماءِ یہود کے زیر اثر تھے اور ان کے دل میں بھی یروشلم کی عظمت تھی۔ اب جب انہیں بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ اُن کے ایمان کا امتحان ہو گیا۔

مزید برآں بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا ہوگا کہ اگر اصل قبلہ بیت اللہ تھا تو ہم نے اب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے جو نمازیں پڑھی ہیں ان کا کیا بنے گا؟ کیا وہ نمازیں ضائع ہو گئیں؟ نماز تو ایمان کا رکنِ رکین ہے! چنانچہ اس اعتبار سے بھی بڑی

تشویش پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسئلہ سیاسی اعتبار سے یہ پیدا ہوا کہ یہود اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں اور محمد ﷺ نے ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے' تو یہ گویا ہمارے ہی پیروکار ہیں' لہٰذا ہمیں ان کی طرف سے کوئی خاص اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اب جب تحویل قبلہ کا حکم آ گیا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ تو کوئی نئی ملت ہے اور ایک نئی اُمت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان کی طرف سے مخالفت کے اندر شدت پیدا ہو گئی۔ یہ سارے مضامین یہاں پر زیر بحث آ رہے ہیں۔

آیت ۱۴۲ ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ﴾ ''عنقریب کہیں گے لوگوں میں سے احمق اور بیوقوف لوگ''

﴿مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ ''کس چیز نے پھیر دیا انہیں اس قبلے سے جس پر یہ تھے؟''

یعنی سولہ سترہ مہینے تک انہوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی ہے' اب انہیں یروشلم کی طرف کس چیز نے پھیر دیا؟

﴿قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب!''

یہ وہی الفاظ ہیں جو چودھویں رکوع میں تحویل قبلہ کی تمہید کے طور پر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کسی ایک سمت میں محدود نہیں ہے' بلکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سب اُسی کے ہیں۔

﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ''وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔''

آیت ۱۴۳ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے''

اب یہ خاص بات کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! تم اس تحویل قبلہ کو معمولی بات نہ سمجھو' یہ علامت ہے اس بات کی کہ اب تمہیں وہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے:

﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ ''تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔''

اب یہ تمہارا فرضِ منصبی ہے کہ رسولؐ نے جس دین کی گواہی تم پر اپنے قول و عمل سے دی ہے اُسی دین کی گواہی تمہیں اپنے قول اور عمل سے پوری نوعِ انسانی پر دینی ہے۔ اب تم محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور نوعِ انسانی کے درمیان واسطہ (link) بن گئے ہو۔ اب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک نبی کی تعلیم ختم ہو جاتی یا اس میں تحریف ہو جاتی تو دوسرا نبی آ جاتا۔ اس طرح پے در پے انبیاء و رُسل علیہم السلام چلے آ رہے تھے اور ہر دَور میں یہ معاملہ تسلسل کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہو رہی ہے' لیکن نسل انسانی کا سلسلہ تو قیامت تک جاری رہنا ہے۔ لہٰذا اب آگے لوگوں کو تبلیغ کرنا' ان تک دین پہنچانا' ان پر حجت قائم کرنا اور شہادت علی الناس کا فریضہ سرانجام دینا کس کی ذمہ داری ہوگی؟ پہلے تو ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ اللہ کی طرف سے جبرائیلؑ وحی لائے اور نبی کے پاس آ گئے' نبی نے لوگوں کو سکھا دیا۔ اب یہ معاملہ اس طرح ہے کہ اللہ سے جبرائیلؑ وحی لائے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے پاس اور محمد ﷺ نے سکھایا تمہیں' اور اب تمہیں سکھانا ہے پوری نوعِ انسانی کو! تو اب تمہاری حیثیت درمیانی واسطے کی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحج کی آخری آیات میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

وَكَذٰلِكَ (اسی طرح) سے مراد یہ ہے کہ تحویل قبلہ اس کا ایک مظہر ہے۔ اس سے اب تم اپنی ذمہ داریوں کا اندازہ کرو۔ صرف خوشیاں نہ مناؤ' بلکہ ایک بہت بڑی ذمہ داری کا جو بوجھ تم پر آ گیا ہے اس کا ادراک کرو۔ یہی بوجھ جب ہم نے بندے محمد ﷺ کے کاندھوں پر رکھا تھا تو ان سے بھی کہا تھا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا﴾ (المزمل) ''(اے نبی!) ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں''۔ وہی بھاری بات بہت بڑے پیمانے پر اب تمہارے کاندھوں پر آ گئی ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَآ﴾ ''اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر (اے نبی!) آپ پہلے تھے''

﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ﴾ ''مگر یہ جاننے کے لیے (یہ ظاہر کرنے کے لیے) کہ کون رسولؐ کا اتباع کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے اُلٹے پاؤں!''

یہاں اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بعد وحیٔ خفی کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کو بیت المقدس کی

طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کا اجتہاد ہو اور اسے اللہ نے قبول فرما لیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد پر اگر اللہ کی طرف سے نفی نہ آئے تو وہ گویا اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا جانا ایک امتحان قرار دیا گیا کہ کون اتباعِ رسولؐ کی روش پر گامزن رہتا ہے اور کون دین سے پھر جاتا ہے۔ اس آزمائش میں تمام مسلمان کامیاب رہے اور ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ٹھیک ہے، ہمارا قبلہ وہ تھا اب آپ نے اپنا قبلہ بدل لیا ہے تو آپ کا راستہ اور ہے ہمارا راستہ اور!

﴿وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بڑی بات تھی مگر ان کے لیے (دشوار نہ تھی) جن کو اللہ نے ہدایت دی۔''

واقعہ یہ ہے کہ اتنی بڑی تبدیلی قبول کر لینا آسان بات نہیں ہوتی۔ یہ بڑا حساس مسئلہ ہوتا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ ''اور اللہ ہرگز تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔''

ایمان سے یہاں مراد نماز ہے جسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات اس تشویش کے جواب میں فرمائی گئی جو بعض مسلمانوں کو لاحق ہو گئی تھی کہ ہماری ان نمازوں کا کیا بنے گا جو ہم نے سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی ہیں؟ مسلمان تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کا پابند ہے، اُس وقت رسول کا وہ حکم تھا، وہ اللہ کے ہاں مقبول ٹھہرا، اِس وقت یہ حکم ہے جو تمہیں رسول کی جانب سے مل رہا ہے، اب تم اس کی پیروی کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ انسانوں کے حق میں بہت ہی شفیق اور بہت ہی رحیم ہے۔''

آیت ۱۴۴ ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ ''(اے نبیؐ!) بلاشبہ ہم آپؐ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھتے رہے ہیں۔''

معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو تحویل قبلہ کے فیصلے کا انتظار تھا اور آپ ﷺ پر بھی یہ وقفہ شاق گزر رہا تھا جس میں نماز پڑھتے ہوئے بیت اللہ کی طرف پیٹھ ہو رہی تھی۔ چنانچہ آپؐ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتی تھیں کہ کب جبریل امین تحویل قبلہ کا حکم لے کر نازل ہوں۔

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ ''سو ہم پھیرے دیتے ہیں آپ کو اُسی قبلے کی طرف جو آپ کو پسند ہے۔''

اس آیت میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ کی طرف سے بڑی محبت' بڑی شفقت اور بڑی عنایت کا اظہار ہو رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کے ساتھ بڑی محبت تھی' اس کے ساتھ آپ کا ایک رشتۂ قلبی تھا۔

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''تو بس اب پھیر دیجیے اپنے رُخ کو مسجد حرام کی طرف!''

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو اَب اپنا چہرہ (نماز میں) اسی کی طرف پھیرو۔''

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ''اور یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی' جانتے ہیں کہ یہ (تحویل قبلہ کا حکم) حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے۔''

تورات میں بھی یہ مذکور تھا کہ اصل قبلۂ ابراہیمیؑ بیت اللہ ہی تھا۔ بیت المقدس کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک ہزار سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا' جسے ''ہیکل سلیمانی'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اَنَّهٗ سے مراد یہاں بیت اللہ کا اس اُمت کے لیے قبلہ ہونا ہے۔ اس بات کا حق ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا یہود پر واضح تھا اور اس کے اشارات و قرائن تورات میں موجود تھے' لیکن یہود اپنے حسد اور عناد کے سبب اس حقیقت کو بھی دوسرے بہت سے حقائق کی طرح جانتے بوجھتے چھپاتے تھے۔ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے مولانا حمید الدین فراہی کا رسالہ ''ذبیح'' بہت اہم ہے' جس کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ''ذبیح کون؟'' کے عنوان سے کیا ہے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

آیت ۱۴۵ ﴿وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ﴾ ''اور (اے نبی!) اگر آپ ان اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں پیش کر دیں تب

بھی یہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔''

﴿وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ ''اور نہ ہی اب آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلے کی۔''

یہ تو ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ والا معاملہ ہوگیا۔

﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ ''اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔''

حد یہ ہے کہ یہ خود آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کی پیروی نہیں کرتے۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ سب کا قبلہ یروشلم ہے' لیکن عین یروشلم میں جا کر یہودی ہیکل سلیمانی کا مغربی گوشہ اختیار کرتے تھے اور مغرب کی طرف رُخ کرتے تھے' جبکہ نصاریٰ مشرق کی طرف رُخ کرتے تھے' اس لیے کہ حضرت مریم سلام علیہا نے جس مکان میں اعتکاف کیا تھا اور جہاں فرشتہ اُن کے پاس آیا تھا وہ ہیکل کے مشرقی گوشے میں تھا' جس کے لیے قرآن حکیم میں ''مَكَانًا شَرْقِيًّا'' کا لفظ آیا ہے۔ عیسائیوں نے اسی مشرقی گھر کو اپنا قبلہ بنالیا۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾ ''اور (اے نبیؐ! بالفرض) اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی''

﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ ''اُس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے''

﴿اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ''تو بلاشبہ آپ بھی ظلم کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔'' (معاذ اللہ!)

آیت ۱۴۶ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔''

یہاں یہ نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم میں تورات اور انجیل کے ماننے والوں میں سے غلط کاروں کے لیے مجہول کا صیغہ آتا ہے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ''جنہیں کتاب دی گئی تھی'' اور جو اُن میں سے صالحین تھے' صحیح رُخ پر تھے' ان کے لیے معروف کا صیغہ آتا ہے' جیسے یہاں آیا ہے۔ يَعْرِفُوْنَهٗ میں ضمیر (ہٗ) کا مرجع قبلہ بھی ہے' قرآن بھی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی ہیں۔

﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ﴾ ''البتہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے''

﴿لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ ''جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔''

آیت ۱۴۷ ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ''یہ حق ہے آپؐ کے ربّ کی طرف سے''

اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: ''حق وہی ہے جو آپ کے ربّ کی طرف سے ہے''۔

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ﴾ ''تو آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بنیں۔''

خطاب کا رُخ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے اور آپؐ کی وساطت سے دراصل ہر مسلمان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اس بارے میں کوئی شک وشبہ اپنے پاس مت آنے دو کہ یہی تو حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے۔

آیت ۱۴۸ ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا﴾ ''ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے''

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ﴾ ''تو (مسلمانو!) تم نیکیوں میں سبقت کرو۔''

ہم نے تمہارے لیے ایک رخ معین کر دیا' یعنی بیت اللہ۔ اور ایک باطنی رخ تمہیں یہ اختیار کرنا ہے کہ نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ جیسے نماز کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے باوضو ہو کر قبلے کی طرف رخ کر لیا اور ارکانِ نماز ادا کیے۔ جبکہ نماز کا باطن خشوع وخضوع' حضورِ قلب اور رقت ہے۔ انسان کو یہ احساس ہو کہ وہ پروردگارِ عالم کے روبرو حاضر ہو رہا ہے۔

﴿اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا﴾ ''جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تم سب کو جمع کر کے لے آئے گا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۱۴۹ ﴿وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''اور جہاں کہیں سے بھی آپؐ نکلیں تو (نماز کے وقت) آپ اپنا رُخ پھیر لیجیے مسجد حرام کی طرف۔''

﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ''اور یقیناً یہ حق ہے آپؐ کے ربّ کی طرف سے۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو۔''

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' یہاں کلام بظاہر آنحضور ﷺ سے ہے' مگر اصل میں آپ کی وساطت سے تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ دوبارہ فرمایا گیا:

آیت ۱۵۰ ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''اور جہاں کہیں سے بھی آپ نکلیں تو آپ اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجد حرام ہی کی طرف کیجیے۔''

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو تو (نماز کے وقت) اپنے چہروں کو اسی کی جانب پھیر دو''

تم خواہ امریکہ میں ہو یا روس میں' نماز کے وقت تمہیں بیت اللہ ہی کی طرف رُخ کرنا ہوگا۔

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ ''تاکہ باقی نہ رہے لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل''

یعنی اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کا کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ تورات میں مذکور تھا کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ خانہ کعبہ ہوگا۔ اگر آنحضور ﷺ یہ قبلہ اختیار نہ کرتے تو علماء یہود مسلمانوں پر حجت قائم کرتے۔ تو یہ گویا ان کے اوپر اتمامِ حجت بھی ہو رہا ہے اور قطع عذر بھی۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ ''سوائے ان کے جو اُن میں سے ظالم ہیں۔''

شریر لوگ اس قطع حجت کے بعد بھی باز آنے والے نہیں اور وہ اعتراض کرنے کے لیے لاکھ حیلے بہانے بنائیں گے' ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ﴾ ''تو (اے مسلمانو!) ان سے نہ ڈرو''

﴿وَاخْشَوْنِيْ﴾ ''اور مجھ سے ڈرو۔''

﴿وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ﴾ ''اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت تمام کر دوں''

یہ جو تحویل قبلہ کا معاملہ ہوا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی بنیاد پر ایک نئی اُمت تشکیل دی جا رہی ہے' اسے امامت الناس سے سرفراز کیا جا رہا ہے اور وراثت ابراہیمی اب

اسے منتقل ہوگئی ہے' یہ اس لیے ہے تاکہ اے مسلمانو! میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔

﴿وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ ''اور تاکہ تم ہدایت یافتہ بن جاؤ۔''

آیت ۱۵۱ ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ﴾ ''جیسے کہ ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے درمیان ایک رسول خود تم میں سے''

﴿يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا﴾ ''وہ تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات''

﴿وَيُزَكِّيْكُمْ﴾ ''اور تمہیں پاک کرتا ہے'' (تمہارا تزکیہ کرتا ہے)

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ''اور تمہیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی''

﴿وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور تمہیں تعلیم دیتا ہے ان چیزوں کی جو تمہیں معلوم نہیں تھیں۔''

یہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا یاد کر لیجیے جو آیت ۱۲۹ میں مذکور ہوئی۔ اس دعا کا ظہور تین ہزار برس بعد بعثت محمدیؐ کی شکل میں ہو رہا ہے۔ یہاں ایک نکتہ بڑا اہم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا میں جو ترتیب تھی' یہاں اللہ نے اس کو بدل دیا ہے۔ دعا میں ترتیب یہ تھی: تلاوتِ آیات' تعلیم کتاب و حکمت' پھر تزکیہ۔ یہاں پہلے تلاوتِ آیات' پھر تزکیہ اور پھر تعلیم کتاب و حکمت آیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جو بات کہی وہ بھی غلط تو نہیں ہو سکتی' لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تنفیذ شدہ (imposed) صورت یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی۔ اس لیے کہ تزکیہ مقدم ہے' اگر نیت صحیح نہیں ہے تو تعلیم کتاب و حکمت مفید نہیں ہوگی' بلکہ گمراہی میں اضافہ ہوگا۔ نیت کج ہے تو گمراہی بڑھتی چلی جائے گی۔ تزکیہ کا حاصل اخلاص ہے' یعنی نیت درست ہو جائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی جتنا بڑا عالم ہوگا وہ اتنا بڑا شیطان بھی بن سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے فتنے عالموں نے ہی اٹھائے ہیں۔ ''دین اکبری'' یا ''دینِ الٰہی'' کی تدوین کا خیال تو اکبر کے باپ دادا کو بھی نہیں آ سکتا تھا' یہ تو ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء تھے جنہوں نے اسے یہ پٹی پڑھائی۔ اسی طرح غلام احمد قادیانی کو بھی الٹی پٹیاں پڑھانے والا حکیم نورالدین تھا' جو بہت بڑا اہل حدیث عالم تھا۔ تو درحقیقت کوئی جتنا بڑا عالم ہوگا اگر اس کی نیت کج ہوگئی تو وہ اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھا دے گا۔ اس پہلو سے تزکیہ مقدم ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے

کہ یہی مضمون سورۂ آل عمران میں اور پھر سورۃ الجمعۃ میں بھی آیا ہے' وہاں بھی ترتیب یہی ہے:
(۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب وحکمت۔

آیت ۱۵۲ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا''

یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ایک بہت بڑا میثاق اور معاہدہ ہے۔ اس کی شرح ایک حدیث قدسی میں بایں الفاظ آئی ہے: ((اَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِيْ' فَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ' وَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَاءٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَاءٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ))(۱) ''میرا بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اُس کے پاس ہوتا ہوں' اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں' اور اگر وہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہت بہتر محفل میں یاد کرتا ہوں''۔ اُس کی محفل تو بہت بلند و بالا ہے' وہ ملأ اعلیٰ کی محفل ہے' ملائکہ مقربین کی محفل ہے۔ امیر خسرو معلوم نہیں کس عالم میں یہ شعر کہہ گئے تھے:۔

خدا خود میر محفل بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم!

﴿وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾ ''اور میرا شکر کرو' میری ناشکری مت کرنا۔''

میری نعمتوں کا ادراک کرو' ان کا شعور حاصل کرو۔ زبان سے بھی میری نعمتوں کا شکر ادا کرو اور اپنے عمل سے بھی' اپنے اعضاء و جوارح سے بھی ان نعمتوں کا حق ادا کرو۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا نصف اوّل مکمل ہو گیا ہے جو اٹھارہ رکوعوں پر مشتمل ہے۔

(۱) صحيح البخاري' كتاب التوحيد' باب قوله تعالى : وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ وصحيح مسلم' كتاب الذكر والدعاء' باب الحث على ذكر الله تعالىٰ۔

فرمان نبوی ﷺ
خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ
''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے''
(رواه البخاري' عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب و تدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۲۴۹

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ
مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ
فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا
طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ
كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

ج ن د

ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

جُنْدٌ ج جُنُوْدٌ (اسم جمع) : فوج، لشکر۔ ﴿اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ﴾ (الدُّخان)
''بے شک وہ لوگ غرق کیا جانے والا ایک لشکر ہیں۔''

غ ر ف

غَرَفَ (ض) غَرْفًا : کسی چیز میں کوئی رقیق مادہ اٹھانا یا بلند کرنا، جیسے چمچے وغیرہ میں شوربہ لینا یا چلو میں پانی اٹھانا، یعنی لینا، بھرنا۔

غُرَفٌ اور غُرُوْفٌ : بلند مقام' بلند رتبہ۔ ﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ﴾ (الزمر: ۲۰) ''لیکن جن لوگوں نے تقویٰ کیا اپنے ربّ کا' ان کے لیے ایک بلند مقام ہے۔'' ﴿وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ﴾ (سبا) ''اور وہ لوگ بلند مقامات میں امن میں ہونے والے ہیں۔''

غُرْفَةٌ : (۱) کسی عمارت میں اوپر کا کمرہ' بالا خانہ۔ ﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ﴾ (الفرقان: ۷۵) ''ان لوگوں کو جزا میں دیا جائے گا بالا خانہ۔'' (۲) چلو' چلو بھر پانی۔ آیت زیر مطالعہ۔

اِغْتَرَفَ (افتعال) اِغْتِرَافًا : اہتمام سے لینا' بھرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ج و ز

جَازَ (ن) جَوْزًا : کسی چیز کے وسط میں ہونا۔

جَاوَزَ (مفاعلہ) مُجَاوَزَةً : وسط سے آگے بڑھنا' گزرنا' دریا کے وسط سے گزرنا یعنی دریا پار کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

تَجَاوَزَ (تفاعل) تَجَاوُزًا : کسی چیز سے آگے بڑھنا' نظر انداز کرنا۔ ﴿وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ (الاحقاف: ۱۶) ''اور ہم نظر انداز کریں گے ان کی برائیوں کو۔''

غ ل ب

غَلَبَ (ض) غَلْبًا : کسی پر بالادستی حاصل کرنا' غالب آنا۔ ﴿رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (المؤمنون: ۱۰۶) ''اے ہمارے ربّ! غلبہ پایا ہم پر ہماری بدبختی نے۔''

غُلِبَ (ماضی مجہول) : غلبہ پایا ہوا ہونا' مغلوب ہونا۔ ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ﴾ (الروم) ''مغلوب ہوئے رومی۔''

غَلَبٌ (اسم ذات) : مغلوبی۔ ﴿وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ﴾ (الروم) ''اور وہ لوگ اپنی مغلوبی کے بعد غالب آئیں گے۔''

غَالِبٌ (اسم الفاعل) : غالب آنے والا' غلبہ پانے والا۔ ﴿فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ﴾ (المائدۃ: ۲۳) ''پس جب تم لوگ داخل ہو گے اس میں تو یقیناً تم لوگ غلبہ پانے والے ہو۔''

مَغْلُوْبٌ (اسم المفعول) : جس پر غلبہ پایا گیا۔ ﴿فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ (القمر) ''تو انہوں نے پکارا اپنے ربّ کو کہ میں مغلوب ہوں پس تو بدلہ لے۔''

غَلِبَ (س) غَلَبًا :موٹی گردن والا ہونا۔
اَغْلَبُ ج غُلْبٌ (افعل الوان وعیوب) :گنجان آبادی' موٹے تنے والا درخت۔
﴿وَحَدَائِقَ غُلْبًا﴾ (عبس) ''اور باغات موٹے تنے والے درختوں کے۔''

ك ث ر

كَثُرَ (ک) كَثْرَةً :تعداد میں زیادہ ہونا۔﴿مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ﴾ (النساء:۷) ''اس میں سے جو کم ہو اُس میں یا زیادہ ہو۔''
كَثْرَةٌ (اسم ذات) : زیادتی' کثرت۔﴿لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ﴾ (المائدۃ:۱۰۰) ''برابر نہیں ہوتے خبیث اور پاکیزہ چاہے بھلی لگے تجھ کو خبیث کی کثرت۔''
اَكْثَرُ (افعل التفضیل) :زیادہ تر' اکثریت۔﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف) ''اور لیکن لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی۔''
كَثِيْرٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت) :زیادہ' بہت۔آیت زیر مطالعہ۔
كُثْرٌ: کسی چیز کی بہتات۔یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔
كَوْثَرٌ: یہ كُثْرٌ کا مبالغہ ہے (تدبر قرآن)۔انتہائی بہتات' بے انتہا۔﴿اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ (الکوثر) ''بے شک ہم نے عطا کیا آپ کو بے انتہا۔''
اَكْثَرَ (افعال) اِكْثَارًا :زیادہ کرنا۔﴿فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ﴾ (الفجر:۱۲) ''پھر انہوں نے زیادہ کیا اس میں فساد کو۔''
كَثَّرَ (تفعیل) تَكْثِيْرًا : بتدریج زیادہ کرنا۔﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ﴾ (الاعراف:۸۶) ''اور یاد کرو جب تم لوگ تھوڑے تھے تو اس نے زیادہ کیا تم لوگوں کو۔''
تَكَاثَرَ (تفاعل) تَكَاثُرًا :ایک دوسرے سے زیادہ ہونے کی کوشش کرنا' کثرت میں مقابلہ کرنا۔﴿وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾ (الحدید:۲۰) ''اور ایک دوسرے پر فخر کرنا تمہارے مابین اور ایک دوسرے سے زیادہ ہونے کی کوشش کرنا مال میں اور اولاد میں۔''
اِسْتَكْثَرَ (استفعال) اِسْتِكْثَارًا :کسی چیز کی کثرت چاہنا' جمع کرنا۔﴿وَلَوْ كُنْتُ

اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ﴾ (الاعراف:۱۸۸) ''اور اگر میں جانتا ہوتا غیب کو تو میں لازماً جمع کرتا بھلائی میں سے۔''

ف ء ی

فَاءَ (ف) فَیْئًا : کسی چیز کو پھاڑ دینا۔

فِئَۃٌ : پھٹا ہوا ٹکڑا' جماعت' گروہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب : ''مُبْتَلِیْکُمْ'' ''اِنَّ'' کی خبر ہے۔ ''مَنْ'' شرطیہ ہے۔ ''شَرِبَ مِنْہُ'' شرط ہے اور ''فَلَیْسَ مِنِّیْ'' جواب شرط ہے۔ ''لَیْسَ'' کا اسم اس کی ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے' اس کی خبر محذوف ہے اور ''مِنِّیْ'' قائم مقام خبر ہے۔ ''اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ'' کا استثناء ''لَمْ یَطْعَمْہُ'' سے ہے۔ ''لَا طَاقَۃَ لَنَا'' کے بعد ''لِلْقِتَالِ'' محذوف ہے۔ ''مُلٰقُوْا'' دراصل اسم الفاعل ''مُلٰقُوْنَ'' ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گرا ہے اور اس کے آگے الف کا اضافہ قرآن مجید کا مخصوص املاء ہے۔ ''کَمْ'' خبریہ ہے اس لیے ''فِئَۃٌ'' کا ترجمہ جمع میں ہوگا۔

ترجمہ:

فَلَمَّا : پھر جب	فَصَلَ : دور ہوا (یعنی روانہ ہوا)
طَالُوْتُ : طالوت	بِالْجُنُوْدِ : لشکروں کے ساتھ
قَالَ : تو اس نے کہا	اِنَّ اللّٰہَ : بے شک اللہ
مُبْتَلِیْکُمْ : تم لوگوں کو آزمانے والا ہے	بِنَھَرٍ : ایک نہر سے
فَمَنْ : پس جس نے	شَرِبَ : پیا
مِنْہُ : اس سے	فَلَیْسَ : تو وہ نہیں ہے
مِنِّیْ : مجھ سے	وَمَنْ : اور جس نے
لَّمْ یَطْعَمْہُ : چکھا ہی نہیں اس کو	فَاِنَّہٗ : تو بے شک وہ ہے
مِنِّیْ : مجھ سے	اِلَّا : مگر یہ کہ
مَنِ : جس نے	اغْتَرَفَ : احتیاط سے بھرا
غُرْفَۃً : (صرف) ایک چلو	بِیَدِہٖ : اپنے ہاتھ سے
فَشَرِبُوْا : پھر ان لوگوں نے پیا	مِنْہُ : اس سے
اِلَّا : مگر	قَلِیْلًا : تھوڑوں نے

مِّنْهُمْ : ان میں سے
جَاوَزَهٗ : اس نے پار کیا اس کو
وَالَّذِيْنَ : اور ان لوگوں نے جو
مَعَهٗ : اس کے ساتھ
لَا طَاقَةَ : کوئی طاقت نہیں ہے
الْيَوْمَ : آج
وَجُنُوْدِهٖ : اور اس کے لشکروں سے
الَّذِيْنَ : ان لوگوں نے جو
اَنَّهُمْ : کہ وہ لوگ

كَمْ مِّنْ : (کہ) کتنی ہی
غَلَبَتْ : غالب ہوئیں
بِاِذْنِ اللّٰهِ : اللہ کی اجازت سے
مَعَ الصّٰبِرِيْنَ : ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے

فَلَمَّا : پھر جب
هُوَ : اس نے
اٰمَنُوْا : ایمان لائے
قَالُوْا : تو ان لوگوں نے کہا
لَنَا : ہم میں (قتال کے لیے)
بِجَالُوْتَ : جالوت سے
قَالَ : کہا
يَظُنُّوْنَ : خیال کرتے تھے
مُّلٰقُوا اللّٰهِ : اللہ سے ملاقات کرنے والے ہیں

فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ : چھوٹی جماعتیں
فِئَةً كَثِيْرَةً : بڑی جماعتوں پر
وَاللّٰهُ : اور اللہ

نوٹ (۱): نہر سے پانی پینے پر پابندی لگا کر اسے آزمائش بنانے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس طرح کچے اور پکے ایمان والوں کی چھانٹی مقصود تھی۔ کیونکہ حضرت طالوت کی فوج میں ہر طرح کے ایمان والے لوگ شامل تھے۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ کچے ایمان والوں کے لیے آزمائش اور سختی میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور سے میدانِ جنگ میں ایسے لوگ جلدی ہمت ہار دیتے ہیں اور راہِ فرار اختیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے فوج کا نظم بگڑ جاتا ہے اور ثابت قدم رہنے والوں کے لیے بھی جنگ جاری رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے کچے ایمان والوں کو پکے ایمان والوں سے الگ کر دیا گیا تا کہ میدانِ جنگ میں صرف وہ لوگ اتریں جو صبر و استقامت کے ساتھ جنگ کریں۔

آج کے دَور میں اس آیت میں ہمارے لیے راہنمائی یہ ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں

اور خاص طور سے میدانِ جنگ میں کامیابی کا انحصار افراد کی تعداد سے زیادہ ان کے level of commitment پر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اسی چیز کی قدر ہے۔ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ کا یہی مطلب ہے۔

آیت ۲۵۰

﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾

ب ر ز

بَرَزَ (ن) بُرُوْزًا : صاف اور کھلی فضا میں نمودار ہونا۔ (۱) کہیں سے نکلنا۔ (۲) کسی کے سامنے آنا' ظاہر ہونا۔ ﴿فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ﴾ (النساء:۸۱) ''پھر جب وہ لوگ نکلتے ہیں آپؐ کے پاس سے۔''

بَارِزٌ (اسم الفاعل) : نکلنے والا' ظاہر ہونے والا۔ ﴿يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ﴾ (المؤمن:۱۶) ''جس دن وہ لوگ ظاہر ہونے والے ہیں۔''

بَارِزَةٌ : صاف اور کھلی ہونے والی۔ ﴿وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً﴾ (الکھف:۴۷) ''اور تو دیکھے گا زمین کو صاف اور کھلی ہونے والی حالت میں۔''

بَرَّزَ (تفعیل) تَبْرِيْزًا : نکالنا' سامنے لانا' ظاہر کرنا۔ ﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ﴾ (الشُّعراء) ''اور سامنے لائی جائے گی دوزخ گمراہوں کے لیے۔''

ف ر غ

فَرَغَ (ن) فَرَاغًا : کسی کام کو ختم کر کے خالی ہونا' فارغ ہونا۔ ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ (الانشراح) ''پھر جب آپؐ فارغ ہوں تو آپ محنت کریں۔''

فَرِغَ (ک) فَرَاغَةً : بے چین ہونا' گھبرانا۔

فَارِغٌ (اسم الفاعل) : فارغ ہونے والا' بے چین ہونے والا۔ ﴿وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا﴾ (القصص:۱۰) ''اور ہو گیا موسیٰؑ کی والدہ کا دل بے چین ہونے والا۔''

اَفْرَغَ (افعال) اِفْرَاغًا : کسی برتن کا پانی گرا کر برتن کو خالی کرنا' اُنڈیلنا۔ ﴿اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا﴾ (الکھف) ''تم لوگ لاؤ میرے پاس تو میں اُنڈیلوں اس پر تانبا۔''

اَفْرِغْ (فعل امر) : تو اُنڈیل۔ آیت زیر مطالعہ۔

ث ب ت

ثَبَتَ (ن) ثُبُوْتًا :ایک حالت پر جمے رہنا' قائم رہنا۔

اُثْبُتْ (فعل امر) :تو جمارہ' قائم رہ۔ ﴿اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا﴾ (الانفال:٤٥) ''جب بھی تم لوگ سامنے آؤ (مقابلہ کے لیے) کسی جماعت کے تو تم لوگ جمے رہو۔''

ثَابِتٌ (اسم الفاعل) : جما رہنے والا' قائم رہنے والا۔ ﴿اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾ (ابراھیم) ''اس کی جڑ جمی رہنے والی ہے اور اس کی شاخ آسمان میں ہے۔''

اَثْبَتَ (افعال) اِثْبَاتًا :(۱) قائم رہنے دینا۔ (۲) ملنے نہ دینا' یعنی قید کرنا۔ ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ﴾ (الرعد:٣٩) ''اللہ مٹاتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور باقی رہنے دیتا ہے۔'' ﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ﴾ (الانفال:٣٠) ''اور جب سازش کرتے تھے آپؐ کے لیے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ وہ قید کریں آپؐ کو' یا قتل کریں آپؐ کو' یا نکالیں آپؐ کو۔''

ثَبَّتَ (تفعیل) تَثْبِيْتًا : جمے رہنے یا قائم رہنے کی صلاحیت دینا' جما دینا' قائم کرنا۔ ﴿لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ (الفرقان:٣٢) ''تاکہ ہم جما دیں اس سے آپؐ کے دل کو۔''

ثَبِّتْ (فعل امر) :تو جما دے۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب :''لَمَّا'' شرطیہ ہے۔ ''بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ'' شرط ہے اور ''قَالُوْا'' سے آیت کے آخر تک جوابِ شرط ہے۔ ''بَرَزُوْا'' اور ''قَالُوْا'' دونوں کے فاعل ان کی ''هُمْ'' کی ضمیریں ہیں جو گزشتہ آیت میں مذکور ''اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ'' کے لیے ہیں۔

ترجمہ:

وَلَمَّا :اور جب	بَرَزُوْا :وہ لوگ سامنے آئے
لِجَالُوْتَ :جالوت کے	وَجُنُوْدِهٖ :اور اس کے لشکروں کے
قَالُوْا :تو ان لوگوں نے کہا	رَبَّنَآ :اے ہمارے ربّ!
اَفْرِغْ :تو انڈیل دے	عَلَيْنَا :ہم پر
صَبْرًا :ثابت قدمی کو	وَّثَبِّتْ :اور تو جما دے
اَقْدَامَنَا :ہمارے قدموں کو	وَانْصُرْنَا :اور تو ہماری مدد کر

عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: کافر قوم (کے مقابلہ) پر

آیت ۲۵۱

﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾

ھ ز م

هَزَمَ (ض) هَزْمًا: کسی خشک چیز کو دبا کر توڑ دینا' شکستہ کرنا' شکست دینا' آیت زیر مطالعہ۔

مَهْزُوْمٌ (اسم المفعول): شکست دیا ہوا۔ ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ﴾ (صٓ:۱۱) ''ایک لشکر ہے جو وہاں شکست دیا جانے والا ہے۔''

د ف ع

دَفَعَ (ف) دَفْعًا: (۱) کسی چیز کو ہٹانا' دور کرنا۔ (۲) کسی کو کسی چیز سے ہٹانا' بچانا' دفاع کرنا۔ (۳) کسی چیز کو کسی کی طرف ہٹانا' دینا' حوالے کرنا۔ ﴿فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (النساء:٦) ''پھر جب تم لوگ ہٹاؤ ان کی طرف (یعنی حوالے کرو ان کے) ان کے اموال تو گواہ بناؤ ان پر۔''

اِدْفَعْ (فعل امر): مذکورہ تینوں معانی میں آتا ہے: (۱) ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:٣٤) ''اور برابر نہیں ہوتیں بھلائیاں اور نہ ہی برائیاں۔ تو دور کر (برائیوں کو) اس سے جو سب سے اچھی ہے۔'' (۲) ﴿وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ﴾ (آل عمران:١٦٧) ''اور کہا گیا ان سے کہ تم لوگ آؤ قتال کرو اللہ کی راہ میں یا دفاع کرو۔'' (۳) ﴿فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ﴾ (النساء:٦) ''تو تم لوگ حوالے کرو ان کے ان کے اموال۔''

دَافِعٌ (اسم الفاعل): ہٹانے والا' بچانے والا۔ ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝﴾ (الطور) ''یقیناً تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے اس سے۔ کوئی

بچانے والا نہیں ہے۔''

دَافَعَ (مفاعلہ) مُدَافَعَةً اور دِفَاعًا : دفاع کرنا' بچانا' ہٹانا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الحج:۳۸) ''بے شک اللہ ہٹاتا ہے ان سے جو لوگ ایمان لائے۔''

ترکیب : ''فَهَزَمُوْا'' کا فاعل اس کی ''هُمْ'' کی ضمیر ہے جو آیت ۲۴۹ میں مذکور ''اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ'' کے لیے ہے۔ اس کے آگے ''هُمْ'' ضمیر مفعولی ہے جو گزشتہ آیت میں ''لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ'' کے لیے ہے۔ ''وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ'' میں ''اٰتٰى'' کا فاعل ''اَللّٰهُ'' ہے' اس میں ''هُ'' کی ضمیر ''دَاوٗدَ'' کے لیے ہے اور یہ اس کا مفعول اوّل ہے' جبکہ ''اَلْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ'' مفعول ثانی ہیں۔ ''لَوْ لَا'' شرطیہ ہے۔ ''دَفْعُ اللّٰهِ'' سے ''بِبَعْضٍ'' تک شرط ہے اور ''لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ'' جواب شرط ہے۔ ''دَفْعٌ'' مصدر نے فعل کا کام کیا ہے اور ''اَلنَّاسَ'' اس کا مفعول ہے' جبکہ ''اَلنَّاسَ'' کا بدل ہونے کی وجہ سے ''بَعْضَهُمْ'' منصوب ہوا ہے۔ ''اَلْعٰلَمِيْنَ'' پر لامِ جنس ہے۔

ترجمہ:

فَهَزَمُوْهُمْ : تو ان لوگوں نے شکست دی ان لوگوں کو	بِاِذْنِ اللّٰهِ : اللہ کے اذن سے
وَقَتَلَ : اور قتل کیا	دَاوٗدُ : داؤد نے
جَالُوْتَ : جالوت کو	وَاٰتٰىهُ : اور دیا اس کو
اللّٰهُ : اللہ نے	الْمُلْكَ : ملک
وَالْحِكْمَةَ : اور دانائی	وَعَلَّمَهٗ : اور اس نے سکھایا اس کو
مِمَّا : اس میں سے جس میں سے	يَشَآءُ : اس نے چاہا
وَلَوْلَا : اور اگر نہ ہوتا	دَفْعُ اللّٰهِ : اللہ کا دفع کرنا
النَّاسَ : لوگوں کو	بَعْضَهُمْ : ان کے بعض کو
بِبَعْضٍ : بعض سے	لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ : تو بگڑ جاتی زمین (نظم کے توازن میں)
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ : اور لیکن اللہ	ذُوْ فَضْلٍ : فضل (کرنے) والا ہے
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ : تمام جہانوں پر	

آیت ۲۵۲

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾

ترکیب : ''تِلْكَ'' مبتدأ ہے اور مرکب اضافی ''اٰيٰتُ اللّٰهِ'' اس کی خبر ہے۔ ''نَتْلُوْهَا'' میں ''هَا'' کی ضمیر مفعولی ''اٰیٰت'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

تِلْكَ : یہ	اٰيٰتُ اللّٰهِ : اللہ کی آیات ہیں
نَتْلُوْهَا : ہم پڑھ کر سناتے ہیں انہیں	عَلَيْكَ : آپ کو
بِالْحَقِّ : حق سے	وَاِنَّكَ : اور بے شک آپ
لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ : بھیجے ہوؤں میں سے ہیں	

آیت ۲۵۳

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۠ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴾

ترکیب : ''تِلْكَ الرُّسُلُ'' مرکب اشاری ہے اور مبتدأ ہے۔ آگے پورا جملہ ''فَضَّلْنَا'' سے ''بَعْضٍ'' تک اس کی خبر ہے۔ ''كَلَّمَ'' کا فاعل ''اللّٰهُ'' ہے اور ''مِنْهُمْ مَّنْ'' اس کا مفعول ہے۔ ''رَفَعَ'' کی ضمیر فاعلی اللہ کے لیے ہے اور ''بَعْضَهُمْ'' مفعول ہے جبکہ ''دَرَجٰتٍ'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس کو تمیز ماننے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ تمیز عموماً واحد نکرہ آتی ہے۔

''اٰتَيْنَا'' کا مفعول اوّل ''عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ'' ہے اس لیے ''ابْنَ'' منصوب ہے (دیکھیں البقرۃ کی آیت ۸۷ نوٹ ۱) جبکہ ''الْبَيِّنٰتِ'' مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ ''اَيَّدْنٰهُ'' کی ضمیر مفعولی ''عِيْسٰى'' کے

لیے ہے۔ ''بِرُوْحِ الْقُدُسِ'' میں ''اَلْقُدُسِ'' پر لام تعریف ہے جو کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے لیے ہے۔ ''مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ'' کے بعد ''کَانُوْا'' محذوف ہے۔ ''مِنْ بَعْدِهِمْ'' میں ''هُمْ'' کی ضمیر ''اَلرُّسُلُ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

تِلْكَ الرُّسُلُ : یہ رسول	فَضَّلْنَا : ہم نے فضیلت دی ہے
بَعْضَهُمْ : ان کے بعض کو	عَلٰى بَعْضٍ : بعض پر
مِنْهُمْ مَّنْ : ان میں وہ بھی ہیں جن سے	كَلَّمَ : کلام کیا
اللّٰهُ : اللہ نے	وَرَفَعَ : اور اس نے بلند کیا
بَعْضَهُمْ : ان کے بعض کو	دَرَجٰتٍ : درجات ہوتے ہوئے
وَاٰتَيْنَا : اور ہم نے دیا	عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ : عیسیٰ ابن مریم کو
الْبَيِّنٰتِ : واضح (معجزے)	وَاَيَّدْنٰهُ : اور ہم نے تقویت دی انؑ کو
بِرُوْحِ الْقُدُسِ : پاک روح سے	وَلَوْ : اور اگر
شَآءَ : چاہتا	اللّٰهُ : اللہ
مَا اقْتَتَلَ : تو آپس میں نہ لڑتے	الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو (تھے)
مِنْۢ بَعْدِهِمْ : ان (رسولوں) کے بعد	مِّنْۢ بَعْدِ مَا : اس کے بعد کہ جو
جَآءَتْهُمُ : آئیں ان کے پاس	الْبَيِّنٰتُ : واضح (نشانیاں)
وَلٰكِنِ : اور لیکن	اخْتَلَفُوْا : ان لوگوں نے اختلاف کیا
فَمِنْهُمْ مَّنْ : تو ان میں وہ بھی ہیں جو	اٰمَنَ : ایمان لائے
وَمِنْهُمْ مَّنْ : اور ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے	كَفَرَ : کفر کیا
وَلَوْ : اور اگر	شَآءَ : چاہتا
اللّٰهُ : اللہ	مَا اقْتَتَلُوْا : تو وہ لوگ آپس میں نہ لڑتے
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ : اور لیکن اللہ	يَفْعَلُ : کرتا ہے
مَا : وہ جو	يُرِيْدُ : وہ چاہتا ہے

نوٹ (۱): ''آسان عربی گرامر'' میں آپ نے پڑھا تھا کہ عموماً غیر عاقل کی جمع مکسر کی صفت' خبر' اسم اشارہ اور ضمیر واحد مؤنث آتی ہے۔ اسی کتاب میں آپ کو تاکید کی گئی تھی کہ جب بھی کوئی قاعدہ پڑھیں تو ذہن میں اس کے استثناء کے لیے ایک کھڑکی ہمیشہ کھلی رکھیں۔ اب نوٹ کریں کہ گزشتہ آیت میں لفظ ''اٰیٰتٌ'' غیر عاقل کی جمع ہے' لیکن مکسر نہیں بلکہ سالم ہے۔ پھر بھی اس کے لیے اسم اشارہ ''تِلْكَ'' اور ضمیر ''هَا'' واحد مؤنث آئی ہے۔ اسی طرح آیت زیر مطالعہ میں لفظ ''اَلرُّسُلُ'' جمع مکسر ہے' لیکن غیر عاقل کی نہیں بلکہ عاقل کی جمع ہے۔ پھر بھی اس کے لیے اسم اشارہ ''تِلْكَ'' واحد مؤنث آیا ہے۔ اس حوالہ سے یہ اصول اب ذہن نشین کر لیں کہ استثناء سے کوئی قاعدہ ساقط نہیں ہوتا بلکہ ثابت ہوتا ہے۔ انگریزی کی معروف کہاوت کا بھی یہی مطلب ہے کہ Exception proves the rule (استثناء قاعدے کو ثابت کرتا ہے)۔

بقیہ: حرفِ اوّل

داعیانہ منصب کی ان اساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے مسلمان معاشروں میں جہاں فکر و فلسفہ' سیاست' معیشت اور معاشرت ہی نہیں اخلاقیات سے بھی دینی تعلیمات کو دیس نکالا دیا جا چکا' ایسی اجتماعی تحریک سے وابستگی ہر باشعور مسلمان پر لازم ہے جو دعوت و تبلیغ کے نبویؐ منہج پر کاربند ہو اور عارضی اور محدود ترغیبات سے کنارہ کش رہتے ہوئے اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصدِ عظیم کے لیے پُر وقار انداز میں عملی جدوجہد میں مصروف ہو۔ ایسی اجتماعیت سے وابستگی سے ہی اس بات کی ضمانت ممکن ہے کہ اس دورِ فتن میں افراد افراط و تفریط کا شکار نہ ہوں۔ آج کے حالات میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کی توقع بھی ایسے 'وابستہ' افراد ہی کے لیے ممکن نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ کفر و الحاد کی آندھیوں اور معصیت اور فسق و فجور کے دھکم پیل میں کسی تنہا شخص کا حق پر قائم رہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تیز سیلابی ریلے کے مقابلے میں تنہا شخص کا کھڑے رہنا مشکل ہے۔ oo

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

ہمسائیگی کے بعض متعین حقوق

مدرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((حَقُّ الْجَارِ اِنْ مَرِضَ عُدْتَهُ وَاِنْ مَاتَ شَيَّعْتَهُ وَاِنِ اسْتَقْرَضَكَ اَقْرَضْتَهُ وَاِنْ اَعْوَرَ سَتَرْتَهُ وَاِنْ اَصَابَهُ خَيْرٌ هَنَّاْتَهُ وَاِنْ اَصَابَتْهُ مُصِيْبَةٌ عَزَّيْتَهُ وَلَا تَرْفَعْ بِنَائَكَ فَوْقَ بِنَائِهِ فَتَسُدَّ عَلَيْهِ الرِّيْحَ وَلَا تُؤْذِيْهِ بِرِيْحِ قِدْرِكَ اِلَّا اَنْ تَغْرِفَ لَهُ مِنْهَا)) (رواه الطبرانی فی الکبیر)

حضرت معاویہ بن حیدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو' اور اگر انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ (اور تدفین کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ)' اور اگر وہ (اپنی ضرورت کے لیے) قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اس کو قرض دو' اور اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو' اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو' اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو' اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے' اور (جب تمہارے گھر کوئی اچھا کھانا پکے تو) تمہاری ہانڈی کی مہک اس کے لیے (اور اس کے بچوں کے لیے) باعثِ ایذا نہ ہو (یعنی اس کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک اس کے گھر تک نہ جائے) اِلّا یہ کہ اس میں سے کچھ اس کے گھر بھی بھیج دو (اس صورت میں کھانے کی مہک اس کے گھر تک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں)''۔

اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے معاشرے میں خوشگوار ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں ہر شخص کو اُس کے حقوق و فرائض سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ اگر معاشرے کے تمام افراد فرائض کی ادائیگی میں اپنی ذمہ داری کا احساس کریں تو ماحول آسودہ ہو جائے گا۔

ہمسایہ انسان کا قریب ترین ساتھی ہوتا ہے' اس کے ساتھ ہر وقت کا رابطہ ہوتا ہے۔ اگر اُس کے ساتھ تعلقات خوشگوار ہوں تو زندگی میں آرام اور سکون میسر آ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہمسایہ کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہوں گے تو زندگی بے مزہ بلکہ تلخ ہو جائے گی۔ ہمسائے کے ساتھ اچھے تعلقات کی بنیاد ہمدردی' خیر خواہی اور خلوص پر ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہمسائے کے گزر اوقات سے واقف رہیں۔ اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اُس کی عیادت اور خبر گیری کریں۔ دوا دارو کی ضرورت ہو تو اس کو لا کر دیں۔ بیماری کی وجہ سے اُسے جس قسم کی امداد کی ضرورت ہو وہ پوری کریں۔ اُس کو تسلی دیں اور ہمدردی کے جذبات کا اظہار کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے مریض کی عیادت کا حکم دیا ہے۔ آپؐ خود بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے اور اُس کا حوصلہ بلند کرنے والی ہمت افزا باتیں کرتے۔ مریض کی عیادت بڑی فضیلت کا کام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے مریض کی عیادت کی تو اللہ کا منادی آسمان سے پکارتا ہے کہ تو مبارک اور عیادت کے لیے تیرا چل کر آنا مبارک' اور تو نے یہ عمل کر کے جنت میں اپنا گھر بنا لیا''۔ (سنن ابن ماجہ)

اگر ہمسایہ فوت ہو جائے تو اُس کے کفن دفن میں اُس کے لواحقین کی مدد کی جائے' اُس کے جنازے میں شریک ہو کر اُس کے لیے مغفرت کی دعا کی جائے' اُس کے پس ماندگان کو صبر کی تلقین کی جائے اور ہر طرح کا تعاون پیش کیا جائے' اُس کے بال بچوں کے لیے خیر خواہی کے جذبات رکھے جائیں اور اُن کا خیال رکھا جائے۔

اگر ہمسایہ کسی مشکل میں پڑ جائے' اُس کی مالی حالت خراب ہو جائے اور وہ قرض کا تقاضا کرے تو آدمی کو تاکید کی گئی ہے کہ اُس کو ضرورت کے مطابق قرض دے۔ اگر مقروض مجبور ہو جائے اور بروقت قرض ادا نہ کر سکے اور قرض دار اسے مہلت دے تو یہ بڑی فضیلت کا کام ہے' اور اگر اُس کی تنگ دستی کے پیش نظر اُسے قرض کی رقم معاف ہی کر دے تو یہ بہت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔

اس حدیث میں ہمسائے کے حقوق کے ضمن میں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ اگر اپنے ہمسائے کی کسی برائی کا علم ہو جائے تو اُس کی پردہ پوشی کی جائے۔ اُس کا کوئی راز معلوم ہو جائے تو اس کو دوسروں پر افشا نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا''۔ ہمسائے

کا ایک حق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر اسے کوئی خوشی ملے تو اس کو مبارک باد دی جائے اور اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی اور تعزیت کی جائے اور اُس کے غم میں شریک ہو کر اسے صبر کی تلقین کی جائے۔

بندے کو لازم ہے کہ اپنے مکان کی دیوار اس طرح بلند نہ کرے کہ ہمسائے کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور اس کے لیے مشکل پیدا ہو' بلکہ ہمسائے کے لیے آسانی پیدا کی جائے اور اسے مشکل و مشقت سے بچایا جائے۔

ہمسائے کے آرام و سکون کا دھیان رکھنے کی تاکید کی گئی ہے' جبکہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے جس سے ہمسائے کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے گھر میں اچھا کھانا پکے تو اس کی مہک کو ہمسائے کے گھر جانے سے روکے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس کھانے میں سے تھوڑا سا اس کے گھر میں بھی بھیج دے' تاکہ اچھے کھانے کی مہک سے ہمسائے کے دل میں طمع اور طلب پیدا نہ ہو جو اس کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جب تم میں سے کسی کے ہاں سالن کی ہانڈی پکے تو اسے چاہیے کہ شوربہ زیادہ کر لے' پھر اس میں سے کچھ پڑوسیوں کو بھی بھیج دے''۔ (جامع اوسط الطبرانی) ظاہر ہے کہ کھانے کی مہک کو تو ساتھ والے گھر تک پہنچنے سے روکا نہیں جا سکتا' تو ایسی صورت میں لازم ہوا کہ ہمسائے کے گھر میں بھی تھوڑا سا کھانا بھیج دیا جائے۔

ہمسائے کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: ''جبرئیل پڑوسی کے حق میں مجھے برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے' یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دے دیں گے''۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) آپ ﷺ نے ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے۔ آپؐ نے تین بار اللہ کی قسم کھائی اور پھر فرمایا کہ ''وہ شخص ایمان والا نہیں جس کے پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہوں''۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ''وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذاؤں سے اس کے پڑوسی مامون نہ ہوں''۔

ہمسایوں کے حقوق کا کماحقہ لحاظ رکھا جائے تو معاشرہ واقعی جنت نظیر بن سکتا ہے۔ دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہونے سے اُن کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے اور مصیبت اور غم

صورت میں تعزیت اور اظہارِ ہمدردی سہارے کا باعث بنتی ہے۔ ہمسائیگی کے تعلقات کو خوش اسلوبی کے ساتھ استوار رکھنا دنیاوی اور اُخروی اجر و ثواب کا باعث ہے' جبکہ ہمسائے سے بے تعلق رہنا اور اُس کی خبر گیری نہ کرنا ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو (بے فکری سے) سو جائے کہ اس کے برابر رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکا ہونے کی خبر بھی ہو''۔ (معارف الحدیث' جلد ششم)

پس اس حدیث سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ہمسایوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھیں' اُن کی خوشی اور غمی میں شریک ہوں' مشکل وقت میں ان کی مدد کریں اور کسی طور پر بھی اُن کے لیے پریشانی اور تکلیف کا باعث نہ بنیں۔

❁❁❁

بانیٔ تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** حفظہ اللہ
کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

**نبی اکرم ﷺ سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں**

اشاعت خاص: 18 روپے ' اشاعت عام: 12 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خُدام القرآن لاہور**
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000
email:anjuman@tanzeem.org

گناہ اور ہماری زندگی پر اس کے اثرات

انتخاب وترتیب: سعدیہ خاور

اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ وسیع وعریض کائنات دراصل ایک امتحان گاہ ہے' جہاں امتحانی پرچہ کو حل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود اور قوانین مقرر کیے ہیں۔ اب جو بھی ان حدود کو پھلانگتا ہے یا قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ گناہ میں قدم رکھتا ہے۔ یہ گناہ اس کی زندگی میں بے قراری و بے چینی پیدا کر دیتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ دنیا میں دل کے سکون سے محروم ہو جاتا ہے اور آخرت میں عذابِ الیم سے دوچار ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۭ﴾ (الانعام: ۱۲۰)

''اور چھوڑ دو وہ سب گناہ جو تم ظاہر میں کرتے ہو اور جو باطن میں۔''

گناہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے یا نبی کریم ﷺ کی مبارک سنت سے روگردانی کرنے کو۔ گناہوں کی مثال کینسر کی مانند ہے۔ جس طرح کینسر جسم میں پھیل کر ہماری جسمانی موت کا سبب بن جاتا ہے اسی طرح اگر ہم گناہوں کو نہیں چھوڑیں گے تو وہ ہماری زندگی میں پھیلتے چلے جائیں گے' حتیٰ کہ ہماری روحانی موت کا سبب بن جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مؤمن گناہ کے قریب بھی نہیں جاتا' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا' چھپا ہوا ہو یا ظاہر' یہ مجھے باطنی اعتبار سے ضرور تکلیف پہنچا کر رہے گا۔

عطاء بن ابی رباح تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ:

''میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ جب بھی کوئی گناہ کرتے ہیں تو ان تمام دروازوں کو بند کر دیتے ہیں جن سے مخلوق دیکھتی ہے' مگر اس دروازے کو بند نہیں کرتے جن سے میں دیکھتا ہوں۔ تو کیا اپنی طرف دیکھنے والوں میں سب سے کمتر درجے کا یہ مجھے ہی سمجھتے ہیں؟''

گناہوں کے اثرات ضرور پہنچ کر رہتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (النساء: ۲۳)

''جو کوئی برا کام کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا''۔

گناہوں کی سزا کی تین صورتیں

دنیا میں انسان کو گناہوں کی سزا تین صورتوں میں ملتی ہے:

(۱) پہلی صورت کا نام ہے نکیر یعنی نقد سزا: اس میں گناہ کے فوراً بعد کوئی نہ کوئی مصیبت یا پریشانی آ جاتی ہے' بالکل ایسے جیسے بچہ بدتمیزی کرے تو ماں فوراً تھپڑ مار دیتی ہے۔ یہ سب سے کم درجہ کی سزا ہوتی ہے۔ آج کل اولاد کی نافرمانی کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے ہیں تو اس کی نقد سزا ہمیں یہ ملتی ہے کہ اولاد ہماری نافرمانی کرتی ہے۔ اسی طرح گناہ کرنے سے ہمارے رزق' مال اور اولاد وغیرہ سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب انسان نیکی کی زندگی گزارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے رزق' مال' اولاد' عمل' عزت' صحت' غرض ہر چیز میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ.....﴾ (الاعراف:۹۶)

''اور اگر یہ بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے.....''

لیکن جب انسان گناہ' معصیت اور ناشکری کی روش اختیار کرتا ہے تو اس روش کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ (النحل)

''اور اللہ تعالیٰ ایک ایسی بستی کی مثال بیان کرتے ہیں جو امن اور اطمینان سے زندگی گزار رہی تھی اور انہیں ہر جگہ سے وافر رزق پہنچ رہا تھا' مگر جب انہوں نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا تو اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا ان کے اعمال کے سبب۔''

(۲) سزا ملنے کے دوسرے طریقہ کا نام تاخیر ہے: یہ پہلی سزا کی بہ نسبت بڑی سزا

ہے' کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ انسان کی رسّی کو ڈھیلا کر دیتے ہیں' یہاں تک کہ جب وہ اپنی سرکشی میں حد سے گزر جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی پکڑ آتی ہے۔ چنانچہ گناہ جوانی میں کیے ہوں تو سزا بڑھاپے میں ملتی ہے۔ قرآن خود گواہی دیتا ہے:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً.....﴾ (الانعام:٤٤)

''پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے کھول دیے' حتیٰ کہ جب وہ اُن بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں' خوب مگن ہو گئے تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا.....''

جب گناہ پر گناہ کرنے کے باوجود نعمتیں مل رہی ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب زیادہ بڑی سزا ملے گی۔ اس لیے اللہ کی نافرمانی سے بہت زیادہ ڈرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ ایک حافظ قرآن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے استاد صاحب نے اسے بدنظری سے توبہ کا کہا' مگر اس نے توبہ نہ کی۔ اس گناہ کی نحوست کی وجہ سے ۲۰ سال بعد قرآن اس کے حافظے سے محو کر دیا گیا۔

(۳) تیسری صورت کا نام ہے خفیہ تدبیر: یعنی سزا اس طریقے سے ملتی ہے کہ انسان کو پتا ہی نہیں چلتا۔ مثلاً بیٹی کا رشتہ نہ ہو رہا ہو یا کاروبار صحیح نہ چل رہا ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے' حالانکہ اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ اگر اللہ کسی کو رزق یا بیٹی کے لیے رشتہ دینا چاہے تو کون ہے جو اسے باندھ سکے؟ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ﴾ (یونس:۱۰۷)

''اور اگر پہنچا دے تمہیں اللہ کوئی تکلیف تو کوئی نہیں اس کو دور کرنے والا اُس کے سوا۔ اور اگر وہ پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو۔''

انسان اپنے حال میں مست رہتا ہے اور اس خفیہ تدبیر کو سمجھ نہیں پاتا۔ عبادات و مناجات سے محرومی بھی سزا کی ایک شکل ہے' مگر ہم اسے سمجھتے نہیں ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے کسی نے کہا کہ دل چاہتا ہے تہجد پڑھوں' کوئی طریقہ بتا دیں! تو فرمایا: ''اے دوست! تو اپنے دن کے اعمال کو ٹھیک کر لے' اللہ تجھے رات کے اعمال کی توفیق عطا فرما دے گا''۔

حدیث پاک میں ہے:

''جب رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کی ایک جماعت کو حکم دیتا ہے کہ فلاں فلاں بندے میرے نیک اور مقبول بندے ہیں۔ جاؤ اور پَر مار کر اُن کو جگا دو تا کہ وہ اُٹھ کر میری عبادت کریں اور میں ان کی جھولیوں کو بھر دوں''۔

دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کی راتیں لہو ولعب میں بسر ہوتی ہیں' مگر انہیں نماز کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔

آج ہماری بے قراری و بے چینی اور عبادت سے محرومی ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ جب تک ہم گناہوں کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے پریشانیاں ہماری جان نہیں چھوڑیں گی۔

پریشانیوں پر نیک بندوں کا طرزِ عمل

پریشانیاں اللہ کے نیک بندوں پر بھی آتی ہیں' مگر ان کا طرزِ عمل تین اعتبارات سے مختلف ہوتا ہے:

(۱) کثرتِ عبادت: جب کسی گناہ گار بندے پر پریشانی آتی ہے تو اس کا دھیان عبادت اور خدا کی طرف سے ہٹ کر محض مادی اسباب و وسائل کی طرف ہو جاتا ہے' جبکہ اس صورت حال میں اللہ کے نیک بندوں کا اللہ کی طرف رجوع اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

(۲) برداشت اور صبر: گناہ گار انسان پریشانی میں اللہ کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے کہ اتنی دعائیں کیں پھر بھی خدا نہیں سنتا ہے' جبکہ اللہ کے نیک بندے سمجھتے ہیں کہ یہ آزمائش اللہ کی طرف سے ہمارے درجات بلند کرنے کی غرض سے آئی ہے اس لیے وہ اور زیادہ صبر و شکر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(۳) دل میں اطمینان: اللہ کے نیک بندوں پر جو بھی پریشانی آتی ہے وہ صرف ظاہر میں ہوتی ہے' ان کا باطن بہت پرسکون اور دل مطمئن ہوتا ہے۔ چنانچہ جب دل میں اُمید بندھی رہے اور اچھے اعمال میں اضافہ ہوتا رہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ پریشانی اس بندے کی بخشش کرانے اور اس کے درجات بلند کرانے آئی ہے۔

دل کی سیاہی کی تین علامات

حدیث نبوی کی رو سے جب کوئی انسان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو یہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے' اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو یہ سیاہی آہستہ آہستہ

پورے دل پر چھا جاتی ہے اور انسان کا دل مکمل طور پر سیاہ کر دیتی ہے۔ دل کے سیاہ ہونے کا اندازہ تین باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

(۱) گناہ کی جھجک ختم: جب انسان کے اعمال حد سے زیادہ خراب ہو جاتے ہیں تو ایک مقام ایسا آتا ہے جب انسان کے دل سے گناہ کی جھجک ختم کر دی جاتی ہے۔ پہلے غیبت کرتے ہوئے دل ڈرتا تھا' مگر اب ساتھ میں جھوٹ اور گالیوں کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ پہلے نامحرم کی طرف دیکھتے ہوئے دل جھجکتا تھا' مگر اب دھڑلے کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ جب کسی کے دل سے گناہ کی جھجک نکال دی جائے تو اللہ سے دوری کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔

(۲) نصیحت کی بات بری لگتی ہے: جب دل سے گناہ کی جھجک نکل جائے تو کسی کا سمجھانا بھی اچھا نہیں لگتا' بلکہ سمجھانے پر آدمی ناراض ہو جاتا ہے۔ ع

میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھاتے ہے!

آج کسی کو نماز پڑھنے کا کہو تو بجائے نصیحت پر کان دھرنے کے الٹا جواب ملتا ہے کہ میں نے اپنی قبر میں جانا ہے' تمہیں اس سے کیا؟

(۳) عبادت بوجھ محسوس ہوتی ہے: دل کے سیاہ ہونے کی تیسری علامت یہ ہے کہ عبادت کرنا انسان کو بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ ''اچھا پڑھتا ہوں'' کرتا کرتا نماز قضا کر دیتا ہے۔ اگر نماز پڑھ بھی لیتا ہے تو سلام پھیرتے ہی بھاگ اٹھتا ہے۔ نماز کے بعد کی تسبیحات اور دعا وغیرہ سے اسے بالکل دلچسپی نہیں رہتی اور سنن و نوافل وغیرہ کو تو یکسر چھوڑ دیتا ہے۔

یہ ہیں گناہوں کی ظلمت کی وہ تین نشانیاں جن کی روشنی میں ہم بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔

دل کی نورانیت کی تین صفات

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی شخص کا دل اصلاح یافتہ ہو اور گناہوں کی سیاہی سے کالا نہ ہوا ہو تو اس کی بھی تین نشانیاں ہیں:

(۱) چہرے پر نور: جب انسان کا دل سنورتا ہے اور اللہ کی رحمت کی نگاہ بندے پر ہوتی ہے تو ایسے شخص کے چہرے پر نور ہوتا ہے۔ اس کی خلوت کی عبادتوں کا نور اس کے چہرے پر سجا دیا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہود کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے آئے تھے' لیکن مشرف باسلام ہو کر واپس لوٹے۔ تو یہود نے ناراض ہو کر اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا: ''میں نے تو ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ ہی دیکھا تھا' دل نے گواہی دی کہ اللہ کی قسم یہ کسی جھوٹے انسان کا چہرہ نہیں ہے!''

(۲) دل میں سرور: اللہ کے نیک بندوں کے دل میں سرور و اطمینان ہوتا ہے۔ اللہ کے فکر میں انہیں عجیب مزہ آتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد)

''آگاہ رہو! اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان حاصل کرتے ہیں۔''

اللہ کے ان بندوں کو اللہ سے قرب کی وجہ سے جو سرشاری' اطمینان اور سرور و نشاط حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور در پر ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے: اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا دنیا کے کاموں میں مددگار رہتا ہے۔ حدیث قدسی ہے:

''اے بندے! ایک تیری مرضی ہے اور ایک میری مرضی ہے' اگر تو چاہے کہ وہ پورا ہو جو تیری مرضی ہے تو میں تجھے تھکا بھی دوں گا اور تیری مرضی کو کبھی پورا نہیں کروں گا۔ اگر تو چاہے کہ وہ پورا ہو جو میری مرضی ہے تو اے بندے میں تیرے کاموں کو سنواروں گا بھی اور تیرے کاموں میں برکت بھی دوں گا''۔

اس بات کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ گھوڑے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تانگے میں استعمال ہونے والے گھوڑے جن کی قیمت ۲۵ سے ۳۰ ہزار تک ہوتی ہے اور دوسرے ریس میں استعمال ہونے والے گھوڑے جن کی قیمت ۲۰ کروڑ تک ہوتی ہے اور ان کی شان ہی الگ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ مجھے یہ ریس لگانے والا گھوڑا دے دیں' میں نے اسے اپنے تانگے میں جوتنا ہے تو اس کا مالک کبھی بھی اس بات پر راضی نہ ہوگا۔ بالکل اسی طرح دین کا کام کرنے والے بھاگتے گھوڑوں کو اللہ تعالیٰ دنیا کی گدھا گاڑی میں لگانا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دنیا کے کام نہیں اٹکاتے اور ان کے کام خود بخود سنور جاتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم گناہوں کی نحوست سے بچ جائیں تو ہمیں چاہیے کہ پہلے گناہوں سے سچی توبہ کر لیں اور آئندہ گناہوں سے باز آ جائیں اور اپنے رب کو راضی کرنے والی زندگی کو اختیار کر لیں۔

حقیقت ومجازِ قرآن (۲)

حافظ محمد زبیر☆

⑳ ایک صیغہ کو دوسرے صیغہ کے مقام پر رکھنا: اس کی کئی اقسام ہیں:

مصدر کا اطلاق فاعل پر ہو' مثلاً:

﴿فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ﴾ (الشعراء:۷۷)

''بے شک وہ سب میرے دشمن ہیں''۔

اس آیت مبارکہ میں 'عَدُوٌّ' مصدر ہے جس کا معنی 'زیادتی کرنا' ہے' جبکہ اس سے مراد فاعل یعنی 'زیادتی کرنے والے' ہے۔

مصدر کا اطلاق مفعول پر ہو' مثلاً:

﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۵۵)

''اور وہ اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے''۔

اس آیت مبارکہ میں 'علم' مصدر ہے جس کا معنی 'جاننا' ہے اور اس سے مراد مفعول یعنی 'معلومات' ہے۔

اسی طرح ﴿صُنْعَ اللّٰهِ﴾ (النمل:۸۸) میں 'صُنْع' سے مراد مصنوع ہے' اور ﴿وَجَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ﴾ (یوسف:۱۸) میں 'كَذِبٍ' سے مراد 'مَكْذُوْب فِيْهِ' ہے۔

اسم مقول کا اطلاق قول پر ہو' مثلاً:

﴿فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا﴾ (الاحزاب:۶۹)

''پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بری قرار دیا اس سے جو بنو اسرائیل نے کہا''۔

اسمِ بشری کا اطلاق مبشر بہ پر ہو' مثلاً:

﴿بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ﴾ (الحدید:۱۲)

☆ ریسرچ فیلو' شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

''تمہاری خوشخبری آج کے دن باغات ہیں''۔

اسم ہوئی کا اطلاق مہوی پر ہو' مثلاً:

﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ (النّٰزعٰت)

''اور اس نے روکا اپنے نفس کو خواہش سے''۔

اسم کا اطلاق مسمّی پر ہو' مثلاً:

﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ﴾ (یوسف: ٤٠)

''نہیں تم عبادت کرتے اللہ کے سوا مگر چند ناموں کی جو نام تم نے ان کو دے دیے ہیں''۔

اس آیت میں 'اَسْمَاءً' سے مراد مسمیات یعنی معبودان باطلہ ہیں۔ اسی طرح ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ (الاعلیٰ) میں بھی 'اِسْمَ' سے مراد مسمّی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

اسم فاعل کا اطلاق مصدر پر ہو' مثلاً:

﴿لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ (الواقعة)

''نہیں ہے اس قیامت کے واقعے ہونے کو کوئی جھٹلانے والی''۔

اس آیت مبارکہ میں اسم فاعل 'كَاذِبَةٌ' سے مراد مصدر 'تکذیب' ہے۔

اسم مفعول کا اطلاق مصدر پر ہو' مثلاً:

﴿بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ﴾ (القلم)

''تم میں سے کون آزمایا گیا (یعنی آزمائش) ہے؟''

اس آیت میں اسم مفعول 'الْمَفْتُوْنُ' سے مراد 'فِتْنَة' ہے جبکہ 'با' زائدہ ہے۔

اسم فاعل کا اطلاق اسم مفعول پر ہو' مثلاً:

﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾ (الطارق)

''وہ (یعنی انسان) پیدا کیا گیا ہے اچھالے گئے پانی سے''۔

اس آیت میں اسم فاعل 'دَافِقٍ' سے مراد اسم مفعول 'مَدْفُوْقٍ' ہے' اسی طرح ﴿جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا﴾ (العنکبوت: ٦٧) میں 'اٰمِنًا' سے مراد 'مَاْمُوْنًا فِيْهِ' ہے۔ اسی طرح ﴿لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ﴾ (ھود: ٤٣) میں 'عَاصم' سے مراد 'مَعْصُوْم' ہے۔

اسم مفعول کا اطلاق اسم فاعل پر ہو' مثلاً:

﴿اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا﴾ (مریم)

''بے شک وہ اس کا وعدہ آنے والا ہے''۔

اس آیت میں اسم مفعول 'مَاْتِیًّا' سے مراد 'اٰتِیًا' ہے۔ اسی طرح ﴿حِجَابًا مَّسْتُوْرًا﴾ (الاسراء:٤٥) میں 'مَسْتُوْرًا' سے مراد 'سَاتِرًا' ہے۔

اسم فعیل کا اطلاق اسم مفعول پر ہو' مثلاً:

﴿وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا﴾ (الفرقان)

''اور کافر اپنے رب کے بالمقابل مدد کیا گیا ہے''۔

اس آیت میں 'ظَهِیْر' اسم مفعول کے معنی میں ہے' یعنی کافر اپنے رب کے بالمقابل مدد کیا گیا ہے شیطان کی طرف سے۔

مفرد کا اطلاق مثنیٰ پر ہو' مثلاً:

﴿وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ﴾ (التوبة:٦٢)

''اور اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اس کو راضی کریں''۔

اس آیت میں 'احق' مفرد ہے جبکہ اس سے مراد مثنیٰ یعنی اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہیں۔

مفرد کا اطلاق جمع پر ہو' مثلاً:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ﴾ (العصر)

''بے شک تمام انسان البتہ خسارے میں ہیں''۔

اس آیت میں 'الانسان' سے مراد تمام انسان ہیں۔

مثنی کا اطلاق مفرد پر ہو' مثلاً:

﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ﴾ (ق:٢٤)

''تم ڈال دو (اس کو) جہنم میں''۔

اس آیت میں 'اَلْقِیَا' سے مراد 'اَلْقِ' ہے۔ اسی طرح ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ (الرحمٰن) میں بعض علماء کے نزدیک 'مِنْهُمَا' یعنی دریائے شیریں اور دریائے شور سے مراد 'منہ' یعنی دریائے شور ہے' کیونکہ ان علماء کے نزدیک دونوں قسم کے موتی ایک ہی دریا (شور) سے نکلتے ہیں۔ اسی طرح ﴿جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا﴾ (نوح:١٦) میں بعض علماء کا کہنا ہے کہ 'فِیْهِنَّ' سے مراد 'فِیْ اِحْدَاهُنَّ' ہے۔ اسی طرح ﴿نَسِيَا حُوْتَهُمَا﴾ (الکھف:٦١) میں بھی 'نَسِیَا' سے مراد ایک ہی ہے اگرچہ صیغہ تثنیہ کا ہے' کیونکہ بھولنے والے صرف حضرت یوشع تھے۔ فراء

نے ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ (الرحمٰن) کو بھی اسی نوع میں شمار کیا ہے۔

مثنیٰ کا اطلاق جمع پر ہو' مثلاً:

﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ﴾ (الملک:٤)

''پھر تم لوٹاؤ (اپنی) نگاہ کو کئی بار''۔

اس آیت میں 'کَرَّتَیْنِ' سے مراد 'کرّات' ہے' کیونکہ صرف دو دفعہ سے نگاہ نہیں تھکتی۔ بعض علماء نے ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ (البقرۃ:٢٢٩) کو بھی اسی نوع میں شمار کیا ہے۔

جمع کا اطلاق مفرد پر ہو' مثلاً:

﴿قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ﴾ (المؤمنون)

''وہ کہے گا اے میرے رب مجھے لوٹائیں''۔

اس آیت میں 'ارْجِعُوْا' سے مراد 'اِرْجِعْ' ہے۔ اسی طرح ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (آل عمران:٣٩) بھی اسی کی مثال ہے۔ اسی طرح ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ﴾ (النحل:٢) کو بھی بعض نے اس میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ﴾ (البقرۃ:٧٢) بھی اسی کی مثال ہے' کیونکہ قاتل ایک تھا۔ ابن فارس نے ﴿بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (النمل) کو بھی اس میں شمار کیا ہے' کیونکہ بعد میں حضرت سلیمانؑ کا قول ﴿ارْجِعْ اِلَيْهِمْ﴾ (النمل:٣٧) نقل ہوا ہے۔ لیکن یہ محلِ نظر ہے' کیونکہ حضرت سلیمانؑ کا یہ خطاب وفد کے سربراہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

جمع کا اطلاق مثنیٰ پر ہو' مثلاً:

﴿قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ (حٰم السجدۃ)

''ان دونوں نے کہا ہم اطاعت کرتے ہوئے آئے ہیں''۔

اس آیت میں 'طَائِعِیْنَ' جمع سے مراد 'طَائِعَیْنِ' تثنیہ ہے۔ اسی طرح ﴿قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ﴾ (صٓ:٢٢) میں 'بَعْضُنَا' دو کے لیے ہے۔ اسی طرح ﴿فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾ (النساء:١١) میں 'اِخْوَۃٌ' جمع سے مراد کم از کم دو ہیں۔ اسی طرح ﴿وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ ...وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ﴾ (الانبیاء) میں 'هُمْ' ضمیر سے مراد دو ہیں۔

ماضی کا اطلاق مستقبل پر ہو' تاکہ وقوع ثابت اور یقینی ہو' مثلاً:

﴿اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ﴾ (النحل:١)

''اللہ کا حکم آئے گا''۔

اس آیت میں 'اَمْرُ اللّٰهِ' سے مراد قیامت ہے اور 'اَتٰی' سے مراد 'یَاْتِیْ' ہے۔ اسی طرح ﴿وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (الزمر:٦٨) اور ﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ﴾ (المائدۃ:١١٦) اور ﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا﴾ (ابراھیم:٢١) اور ﴿وَنَادٰی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ﴾ (الاعراف:٤٨) بھی اسی نوع کی مثالیں ہیں۔

مستقبل کا اطلاق ماضی پر ہوتا کہ دوام اور استمرار کا فائدہ دے' مثلاً:

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ﴾ (البقرۃ:١٠٢)

''اور انہوں نے پیروی کی اس کی جو کہ شیاطین حضرت سلیمانؑ کی بادشاہت میں پڑھتے تھے''۔

اس آیت میں 'تَتْلُوْا' مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہے۔ اسی طرح ﴿فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِیَاءَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:٩١) اور ﴿فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (البقرۃ:٨٧) اور ﴿وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا﴾ (الرعد:٤٣) بھی اسی کی مثالیں ہیں۔ بعض نے ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ (البقرۃ:٤٤) کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔

اسم الفاعل کا اطلاق مستقبل پر ہو حالانکہ اس کا ترجمہ حال کا ہوتا ہے' مثلاً:

﴿وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ﴾ (الذّٰریٰت)

''اور بے شک بدلے کا دن واقع ہوگا''۔

اسم مفعول کا اطلاق مستقبل پر ہو حالانکہ اس کا ترجمہ حال کا ہوتا ہے' مثلاً:

﴿ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ﴾ (ھود:١٠٣)

''یہ دن ہے' اس کے لیے لوگوں کو جمع کیا جائے گا''۔

خبر کا اطلاق طلب پر ہو' مثلاً:

﴿وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ (البقرۃ:٢٣٣)

''اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں''۔

اس آیت میں 'یُرْضِعْنَ' مضارع کا صیغہ امر کے معنی میں ہے۔ اسی طرح

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ﴾(البقرۃ:۲۲۸) اور ﴿وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:۲۷۲) بھی اس کی مثالیں ہیں۔ بعض علماء نے ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ (الواقعۃ) کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ اور ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ﴾(البقرۃ:۸۳) بھی اسی کی مثال ہے۔

طلب کا اطلاق خبر پر ہو' مثلاً:

﴿اِتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ﴾ (العنکبوت:۱۲)

''تم ہمارے راستے کی پیروی کرو' ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے''۔

اس آیت میں 'وَلْنَحْمِلْ' طلب کا صیغہ خبر کے معنی میں ہے۔ اس کی دلیل ﴿وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾(العنکبوت:۱۲) ہے' کیونکہ 'کذب' خبر میں ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح ﴿فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا﴾(مریم:۷۵) میں بھی طلب بمعنی خبر ہے۔ بعض علماء نے ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾(یوسف:۹۲) کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔

ندا کو تعجب کے موقع پر رکھنا' مثلاً:

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ﴾ (یٰسٓ:۳۰)

ندا اشخاص کی ہوتی ہے اور حسرت کی نہیں ہوسکتی' اس لیے یہ ندا نہیں تعجب ہے۔ اس آیت کے بارے میں فراء نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے 'یا لھا حسرۃ'۔

جمع قلت کا اطلاق جمع کثرت پر ہو' مثلاً:

﴿وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ﴾ (سبا)

''اور وہ لوگ بالاخانوں میں امن والے ہوں گے''۔

اس آیت میں 'غُرُفَاتٍ' جمع قلت ہے اور جمع قلت وہ ہوتی ہے جو کہ تین سے لے کر دس تک بولی جائے۔ ﴿هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ﴾(آل عمران:۱۶۳) اور ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ﴾ (الزمر:۴۲) اور ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾(البقرۃ:۱۸۴) بھی اس کی مثالیں ہیں' کیونکہ 'دَرَجَات' اور 'اَنْفُس' اور 'مَعْدُوْدَات' جمع قلت ہیں لیکن ان سے مراد کثرت ہے۔

جمع قلت پر جمع کثرت کا اطلاق' مثلاً:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ (البقرۃ:۲۲۸)

''اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں''۔

اس آیت میں 'قُرُوْءٍ' جمع کثرت ہے' حالانکہ بات تین حیض کی ہو رہی ہے اور تین حیض جمع قلت ہے۔

اسم مؤنث کو مذکر بنانا' مثلاً:

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (البقرۃ:۲۷۵)

''پس جس کے پاس آ گئی اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت''۔

اس آیت میں 'مَوْعِظَةٌ' مؤنث کو فعل 'جَآءَ' کے ساتھ مذکر بنایا گیا ہے۔ ﴿وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾ (ق:۱۱) میں 'مَيْتًا' اور ﴿فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ﴾ (الانعام:۷۸) میں 'هٰذَا' اور ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (الاعراف) میں 'قَرِيْبٌ' بھی اس کی مثالیں ہیں۔

مذکر کو مؤنث بنانا' مثلاً:

﴿اَلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (المؤمنون)

''جو لوگ (جنت) فردوس کے وارث بنیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اس آیت میں 'اَلْفِرْدَوْسَ' مذکر کو 'هَا' ضمیر کے ساتھ مؤنث بنایا گیا ہے۔ اسی طرح ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (الانعام:۱۶۰) میں 'عشر' کو مذکر لایا گیا حالانکہ قواعد کے مطابق اس کو 'عشرۃ' ہونا چاہیے' کیونکہ 'امثال' مذکر ہے۔

تغلیب یعنی ایک شے کو اس کے غیر کا حکم دینا' یا دو امروں میں ایک امر کو دوسرے پر ترجیح دینا' یا ایک ہی لفظ کا راجح اور مرجح دونوں پر معاً اطلاق کرنا۔ اس طرح گویا دو مختلف چیزوں کو دو متفق اشیاء کے قائم مقام کیا گیا ہو' مثلاً:

﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ﴾ (الانعام:۱۳۲)

''اور ہر ایک کے لیے درجات ہیں''۔

اس آیت میں کافر اور مؤمن دونوں کے لیے 'درجات' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ 'درجات' کا لفظ بلندی کے لیے بولا جاتا ہے اور پستی کے لیے 'درکات' کا لفظ ہے لیکن یہاں تغلیباً 'درجات' کا لفظ کفار کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ﴾ (التحریم:۱۲) اور ﴿كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ﴾ (العنکبوت:۳۲) بھی اسی کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ (النمل) اور ﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾(الرعد:۱۵)اور ﴿اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا﴾(الاعراف:۸۸)اور ﴿اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ﴾(الاعراف:۸۹) اور ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَةُ کُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِیْسَ﴾(الحجر:۳۰'۳۱) بھی اس کی مثالیں ہیں۔اسی طرح ﴿یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ﴾(الزخرف:۳۸) میں مغرب کو مشرق اس لیے کہا کہ وہ زیادہ مشہور ہے۔

تضمین یعنی ایک شے کو دوسری شے کے معنی عطا کیے جائیں۔یہ حروف' اسماء اور افعال میں ہوتی ہے۔اگر ایک فعل دوسرے فعل کے معنی کو متضمن ہوگا تو اس میں ایک ساتھ دونوں فعلوں کے معنی پائیں جائیں گے۔اس کی صورت یہ ہے کہ کسی فعل کو ایسے حرف کے ساتھ متعدی کیا جائے کہ وہ اس حرف کے ساتھ عادتاً متعدی ہو کر نہ آتا ہو تو ایسی صورت میں وہ فعل اپنی یا اس حرف کی تاویل کا محتاج ہوگا تاکہ اس کا اس حرف کے ساتھ تعدیہ صحیح ہو سکے۔اگر فعل کی تاویل کی جائے تو فعل کی تضمین ہوگی اور اگر حرف کی تاویل کی جائے تو حرف کی تضمین ہو گی۔اس میں اختلاف ہے کہ دونوں میں کس کی تضمین اولیٰ ہے۔اہل لغت اور نحویوں کا قول ہے کہ گنجائش حروف میں پائی جاتی ہے' یعنی ان کی تضمین کر لی جائے' جبکہ محققین کا قول ہے کہ فعل میں توسع ہے لہٰذا اس کی تضمین کی جائے گی' کیونکہ فعل میں تضمین کثرت سے پائی جاتی ہے۔تضمین کی مثال درج ذیل ہے:

﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (الدھر:٦)

''ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے''۔

فعل 'یَشْرَبُ' کا تعدیہ 'مِن' کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ اس آیت میں یہ حرف 'باء' کے ساتھ متعدی اس اعتبار سے ہوگا کہ اس کو 'یتلذذ' یا 'یروی' کے معنی میں لیا جائے' کیونکہ یہ دونوں 'باء' کے ساتھ متعدی ہو جاتے ہیں' یا پھر حرف 'باء' کو حرف 'من' کے معنی میں متضمن کیا جائے گا۔اسی طرح ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ﴾(البقرۃ:۱۸۷) میں 'الرَّفَثُ' کو 'اِلٰی' کے ساتھ متعدی اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کو 'افضاء' کے معنی میں نہ لیا جائے۔

اسماء میں تضمین یہ ہے کہ دونوں اسموں کے معنی کا ایک ساتھ فائدہ دینے کے لیے ایک اسم دوسرے اسم کے معنی کو متضمن ہو' مثلاً ﴿حَقِیْقٌ عَلٰٓی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ (الاعراف:۱۰۵) میں 'حَقِیْقٌ' حریص کے معنی کو متضمن ہے' یہ ذہن میں رہے کہ لفظ کی وضع

حقیقت اور مجاز دونوں کے واسطے ایک ساتھ نہیں ہوئی لہٰذا ان دونوں کو ایک ساتھ جمع کرنا بھی مجاز ہی ہے۔

اس کے علاوہ بعض علماء نے مجاز کی بعض دوسری اقسام بھی بیان کی ہیں' مثلاً حروفِ جر کا استعمال ان کے غیر حقیقی معنوں میں اور غیر وجوب، کے لیے صیغہ افعل اور غیر تحریم کے لیے صیغہ لَا تَفْعَلْ اور ادواتِ تمنی' ترجی' نداء کا استعمال ان کے ماسوا امور کے لیے اور ادواتِ استفہام کا استعمال غیر تصور اور تصدیق کے لیے' وغیرہ۔

حقیقت و مجاز کی بعض اختلافی اقسام

چھ اقسام ایسی ہیں کہ ان کے حقیقت یا مجاز ہونے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ یہ اقسام درج ذیل ہیں:

۱) حذف:

یہ مجاز کی ایک معروف قسم ہے۔ بعض علماء نے اس کے مجاز ہونے کا انکار کیا ہے' کیونکہ مجاز کی تعریف ہے کہ کسی لفظ کو اس کے موضوع لہ معنی (یعنی جس کے لیے وہ وضع کیا گیا ہے) کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال کرنا' جبکہ حذف میں ایسا نہیں ہوتا۔

علامہ ابن عطیہؒ نے کہا ہے کہ مضاف کا حذف عین مجاز ہے جبکہ ہر ایک حذف مجاز نہیں ہوتا۔ اسی طرح فراء کا کہنا ہے کہ حذف کی چار اقسام ہیں:

پہلی قسم یہ کہ جس پر لفظ اور اس کے معنی کی صحت 'من حیث الاسناد' موقوف ہو' مثلاً: ﴿وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ﴾ (یوسف:۸۲) میں 'اَھْل' محذوف ہے کیونکہ 'قَرْیَة' کی طرف سوال کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے' بلکہ یہاں پر سوال کی نسبت محذوف 'اھل' کی طرف ہوگی۔ حذف کی صرف اسی قسم کو ابن عطیہ مجاز کہتے ہیں۔

امام زنجانیؒ نے لکھا ہے کہ حذف اس وقت مجاز ہوگا جب کہ اس سے کوئی حکم بدل گیا ہو' ورنہ اگر کسی جگہ حذف سے حکم تبدیل نہ ہو تو یہ حذف مجاز نہ ہوگا۔

امام قزوینیؒ نے لکھا ہے جب حذف کی وجہ سے کلمہ کا اعراب تبدیل ہو جائے تو وہ مجاز ہو گا اور اگر حذف سے کلمہ کا اعراب تبدیل نہ ہو تو وہ مجاز نہ ہوگا۔

۲) تاکید:

بہت سے علماء نے تاکید کو مجاز کہا ہے' جبکہ امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ صحیح رائے یہی ہے کہ

یہ حقیقت ہے۔

۳) تشبیہ:

علماء کی ایک جماعت نے اسے مجاز کہا ہے' جبکہ امام سیوطیؒ کا کہنا ہے کہ صحیح رائے کے مطابق یہ حقیقت ہے۔ شیخ عزالدین کا کہنا ہے کہ اگر تشبیہ کسی حرف کے ساتھ ہو تو یہ حقیقت ہو گی اور اگر حرف تشبیہ محذوف ہو تو یہ مجاز ہو گا' کیونکہ حذف مجاز کی ایک قسم ہے۔

۴) کنایہ:

کنایہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے' مثلاً ﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ﴾ (النساء: ۴۳) میں 'الْغَآئِطِ' کا لفظ بیت الخلاء کے لیے کنایہ ہے۔ اس کے بارے میں چار اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ ابن عبدالسلامؒ کا یہی قول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مجاز ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ نہ حقیقت ہے نہ مجاز۔

چوتھا قول امام سبکیؒ کا ہے کہ کنایہ بعض اوقات حقیقت ہوتا ہے اور بعض اوقات مجاز۔

۵) تقدیم وتأخیر:

علماء کی ایک جماعت نے کلام میں تقدیم وتأخیر (مثلاً مفعول کا مقدم ہو جانا یا فاعل کا مؤخر ہو جانا وغیرہ) کو بھی مجاز کہا ہے۔ لیکن امام زرکشیؒ کا کہنا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ مجاز کی قسم نہیں ہے۔

۶) التفات:

التفات کا معنی ہے کسی کلام کو ایک اسلوب سے کسی دوسرے اسلوب کی طرف نقل کر دینا' مثلاً تکلم سے خطاب کی طرف ملتفت ہونا۔ امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ میں نے کسی شخص کو بھی نہیں دیکھا کہ جس نے 'التفات' کے حقیقت یا مجاز ہونے کی نسبت سے کوئی بات کی ہو' لیکن میرے خیال میں یہ حقیقت ہی ہے۔

شرعی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ' زکوٰۃ' صیام اور حج وغیرہ کے الفاظ جب قرآن میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کے شرعی معنی حقیقی معنی کہلائیں گے' جبکہ ان اصطلاحات کے لغوی معنی مجازی معنی ہوں گے۔

❁❁❁

نظم ومناسباتِ قرآن

جواد حیدر ☆

قرآن مجید علم کا بحر بیکراں ہے جس میں جتنا بھی گہرا اتر اجائے تشنگی اتنی ہی بڑھتی ہے۔ یہ کسی ایک مخصوص فن کی کتاب نہیں اور نہ ہی ایسی کتاب ہے جس میں کچھ کہنا باقی رہ گیا ہو۔ یہ اسلامی شریعت کا اوّلین سرچشمہ ہے۔ قرآن مجید کے بے شمار علوم میں سے ایک علم نظم و مناسبات کا بھی ہے' جس کی بنیاد قرآن مجید کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر ہے۔ اس بنیاد پر انسانی عقل نے جو کچھ جانا صفحات کی زینت بنا دیا۔

اس علم کے تعارف' اس کی اقسام اور حیثیت کے بارے میں جدید وقدیم لٹریچر میں بہت سے نظریات ملتے ہیں۔ ہم اس حقیری کاوش میں ان کا علمی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

لغوی واصطلاحی مباحث

لغوی تعریف

لغت میں نظم کا معنی باہم ملانا' ترتیب دینا' منسلک کرنا ہے(۱)۔ لڑی' منسلک' موزوں کلام' بندوبست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے(۲)۔ صاحب معجم الوسیط لکھتے ہیں: ''یقال نظم من لؤلؤ'' یعنی موتیوں کی لڑی اور اسی طرح ترتیب اور ملانے(۳) کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

مناسبت کے لغوی معنی موزوں' موافق' مشابہ(۴)' باہمی تعلق' موزونیت(۵)' ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا(۶) کے ہیں۔ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:

وتقول لیس بینهما مناسبة' ای : مشاکلة (۷)

''جیسے آپ کا کہنا کہ ان دونوں میں مناسبت نہیں ہے' یعنی مشاکلت نہیں ہے''۔

گویا مناسبت کے معنی اتصال' مقاربت' موافقت' مشابہت' مماثلت اور مشاکلت وغیرہ کے ہیں۔

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

اصطلاحی تعریف اور معنی و مفہوم

کسی ایک آیت میں جملوں' آیات یا سورتوں کے باہمی ربط کا کوئی سبب نظم قرآن یا مناسبت قرآن کہلاتا ہے۔(۸)

امام سیوطی کا فرمانا ہے کہ آیات وغیرہ میں مناسبت ایسا معنی ہوتا ہے جو ان آیات کے مابین ربط کا کام دے(۹)۔ البقاعی لکھتے ہیں ''یہ ایسا علم ہے جس سے قرآن مجید کے اجزاء کی ترتیب کی معرفت حاصل ہوتی ہے''۔(۱۰)

امام سیوطیؒ نے ابن العربی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قرآن کی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ یوں ربط دینا کہ وہ سب مل کر ایک باہم مناسبت رکھنے والے الفاظ اور مسلسل معانی کا ایک مجموعہ مرتب کلام اور ایک کلمہ معلوم ہونے لگے''۔(۱۱)

امام زرکشیؒ فرماتے ہیں:

''مناسبت ایسی معقول بات کو کہتے ہیں کہ جب اسے عقلوں پر پیش کیا جائے تو وہ اسے قبول کرلیں''۔(۱۲)

گویا نظم و مناسبتِ قرآن ایسا علم ہے جو قرآن مجید کے اجزاء' جملوں' آیات یا سورتوں کو ایسے معنیٰ مشترک میں پرو دینے سے عبارت ہے جس سے وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ رہیں بلکہ باہم مربوط اور مرتب دکھائی دیں اور ایک ہی بات کا تسلسل اور آہنگ معلوم ہوں۔ یہ ربط ماقبل جملے کی تفسیر سے متعلق بھی ہوسکتا ہے' عام کو خاص کرنے' علت کا معلول لانے' حکم کی حکمت بتانے اور مترادفات و متضادات لانے سے بھی۔ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی لکھتے ہیں:

''ادب میں جب مناسبت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب دو الفاظ یا جملوں میں لفظی یا فکری و معنوی قربت اور ہم آہنگی ہوتا ہے''۔(۱۳)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا''۔(۱۴)

امام سیوطی کا کہنا ہے:

''قرآن پاک کی آیات میں مناسبت کا مفہوم یہ ہے کہ دو آیات کے مابین عام معنی یا خاص معنی' عقلی و حسی مفہوم یا خیالی و واقعاتی مفہوم میں کوئی قدر مشترک یا جامع تصور

موجود ہے' جس نے آیات کی موجودہ ترتیب کو قبول کیا ہے۔ مثال کے طور پر رابطہ کی ایک شکل تلازم ذہنی ہے' یعنی پچھلی آیت میں جو مفہوم بیان ہوا ہے اس کا ناگزیر حصہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے' جیسے علت اور معلول کا رابطہ ہے' ایک آیت میں کوئی حکم بیان ہوا اور بعد کی آیت میں اس کی علت و حکمت بیان ہوئی اور دونوں آیات نے مل کر مفہوم کے پیکر کو مکمل کر دیا۔ رابطہ کی ایک شکل شے اور اس کی ضد کا بیان ہے' ایک آیت میں ایک تصور اور نظریہ کی وضاحت کر دی گئی اور دوسری آیت میں اس کے متضاد تصور اور متصادم نظریہ کی کیفیت بیان کر دی گئی اور دونوں آیتوں نے مل کر نظریہ کی تجسیم مکمل کر دی''۔(۱۵)

نظم و مناسبت کی اقسام

تیسری صدی ہجری میں علوم کے بے حد پھیلاؤ کے بعد نکتہ سنجیوں' عجائب و غرائب قرآن کی باریکیوں اور فقہی و تفسیری موشگافیوں نے زور پکڑا' اور قرآن مجید کے بارے میں نبی مکرم ﷺ کے اس بیان:

((لَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهُ))(۱۶)

''علماء اس قرآن سے سیر نہیں ہوتے' یہ قرآن کثرت تلاوت سے پرانا نہیں ہوتا اور اس کے عجائب نہ ختم ہونے والے ہیں'' کے مطابق بحر قرآنی میں لوگوں نے غوطے لگا کر اس کے عجائب تلاش کرنے شروع کیے تو اس سے بے شمار علوم کی طرح پڑتی گئی' قرآن سے ان کا شغف اور دلچسپی جتنی بڑھتی رہی ان کی تشنگی اتنی ہی زیادہ ہوتی چلی گئی۔ اور جب آیات و سور میں باہمی نظم و مناسبت کی بات ہوئی تو علماء اس میں بھی بہت آگے تک گئے۔ اور چونکہ ان سارے مباحث اور تعبیرات کی بناء وحی پر نہ تھی' بلکہ ان میں محض عقلی اور قیاسی و اجتہادی زور تھا اس لیے ان میں علماء کے مابین بے حد اختلاف بھی پیدا ہوا۔ ایک طرف تو بہت بڑی تعداد میں مفسرین کا وہ گروہ تھا جس نے اس علم کے محض عقلی ہونے کی بناء پر اس سے ذرہ برابر بھی اعتناء نہ کیا۔ دوسرا مکتبۂ فکر وہ ہے جو نظم و مناسبت کو اہمیت تو دیتے ہیں' لیکن ہر جگہ نظم تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اسے لازمی قرار دیتے ہیں۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو پورے قرآن کو منظم اور مربوط تسلیم کرتا ہے۔ پھر آگے ان کی کئی قسمیں ہیں' بعض وہ ہیں جو پورے قرآن مجید کو موضوع واحد اور ہیئت واحدہ

قرار دیتے ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جو ہر آیت کو ماقبل سے مربوط قرار دیتے ہیں اور ایک سورۃ کی تمام آیات کو ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ ان میں بعض وہ بھی ہیں جو سورۃ میں ایک مرکزی موضوع منتخب کرتے اور تمام آیات کو اسی سے جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں نظم کی بنیادی طور پر دو اقسام اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔

(۱) وحدۃ الموضوع یعنی موضوع اور مرکزی نقطہ کی وحدت۔

(۲) مناسبت کی دیگر انواع: جیسے الفاظ کا الفاظ سے ربط' اجزاء آیات کا نظم' آیات اور سورتوں کی مناسبت وغیرہ۔

نظریۂ وحدتِ موضوع

یہ نظریہ دو انداز سے پیش ہوا ہے: ایک یہ کہ پورا قرآن ایک ہی موضوع میں سمٹا ہوا ہے اور دوسرا یہ کہ ہر سورۃ کا ایک مرکزی موضوع ہے۔ پورے قرآن مجید میں وحدتِ موضوع کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک ہی عنوان ہے اور اسی کے تحت تمام سورتوں اور آیات کو لایا گیا ہے۔ ابن عربی اپنی کتاب ''سراج المریدین'' میں لکھتے ہیں:

ارتباط آی القرآن بعضها ببعض حتی تکون کالکلمة الواحدة (۱۷)

یعنی ''قرآن مجید کی آیات ایک دوسرے سے اس طرح مرتبط ہیں گویا وہ ایک ہی کلمہ ہے''۔

یہ بات قرآن مجید کے جزوی مطالعہ سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ ایک ہی بات کو ثابت کرنے کے لیے ساری آیات اور سورتیں لائی گئی ہیں۔ اور پورے قرآن کی آیات باہم اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ ایک ہی عمارت کے مختلف دریچے ہیں۔ قرآن مجید کا موضوع ''انسان'' ہے اور پورے قرآن میں انسان کی دُنیوی واُخروی فوز وفلاح مدنظر رکھی گئی ہے۔ اور اسی نقطے کے تحت تمام آیات وسور کو باہم جوڑا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی قرآن کا نظام بیان کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''قرآن میں بحیثیت مجموعی بھی ایک مخصوص نظام ہے جس کا ایک پہلو تو بالکل ظاہر ہے جو ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے' لیکن ایک پہلو مخفی ہے جو غور وتدبر سے سامنے آتا ہے''۔ (۱۸)

آگے چل کر مولانا قرآن مجید کے سات گروپ بناتے ہیں اور اس ترتیب کی حکمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اسی کو قرآنی نظم کے بحیثیت مجموعی مخفی وظاہری پہلو سمجھتے ہیں۔

وحدت موضوع ہی میں دوسرا پہلو کسی ایک سورۃ کا موضوع ہے جس کے گرد اس سورۃ کی

تمام آیات رکھ دی گئی ہیں۔ فراہی مکتبۂ فکر اسے سورۃ کے عمود کے نام سے جانتا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی لکھتے ہیں:

''عمود ہر سورۃ کا ایک ہی ہوتا ہے' لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ مثلاً سورۃ الحجرات کے عمود کو لو۔ ہے یہ ایک ہی بات' گو لغت میں ہم اس کے لیے ایک ہی جامع لفظ نہ پا سکیں۔ تعبیر مطلب کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بدخلقی پر ملامت اور جھڑکی ہے' عام اس سے کہ وہ بدخلقی خیال سے تعلق رکھتی ہو' یا قول سے یا عمل سے۔ چنانچہ اس میں نبی ﷺ کے سامنے گفتگو میں سبقت' آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے' عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے' بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر ٹوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح' ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے' ان کی عیب جوئی سے' تنابز بالالقاب سے' بدگمانی سے' تجسس سے' غیبت سے' غرورِ نسب سے' ادعائے پارسائی سے' اور پھر سب سے آخر میں' سب سے بدترین شے' یعنی نبی کریم ﷺ پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ ایک مثال میں نے اس لیے پیش کی ہے کہ تم وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھ سکو''۔(۱۹)

آگے چل کر انہوں نے پورا مقدمہ اس بات پر باندھا ہے کہ ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے۔ دیکھئے مقدمہ نمبر (۷) ص ۵۱' مقدمہ نظام القرآن' مجموعہ تفاسیر فراہی۔

الفاظ' آیات' اجزاءِ آیات اور سورتوں کی مناسبت

ان کی تفصیل ہم الگ الگ بیان کرتے ہیں:

(ا) الفاظ کا نظم: قرآن مجید میں جو اسلوب اپنایا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایسے خوبصورت اور دلکش انداز سے آیات اور سورتوں کی بناوٹ رکھی گئی ہے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ ہر آیت چھوٹی ہو یا بڑی' ایک مستقل معنی رکھتی ہو یا الگ الگ معنی دینے والے مختلف اجزاء پر مشتمل ہو' حتیٰ کہ ایک ایک لفظ اور حرف بڑی خوبصورتی سے ایک دوسرے سے جوڑے گئے ہیں' کہیں آیت محض دو چار الفاظ پر مشتمل ہے' کہیں لمبے لمبے فقرات سے مزین ہے جو باہم ایک زبردست انداز سے مربوط ہیں۔ آیات میں الفاظ کا باہمی نظم یا تو محض لفظ کے ظاہری اعتبار سے ہے یا لفظ کے معنی کی حیثیت سے۔

الفاظ کی مناسبت کا معنی کسی آیت کے ایک لفظ کا دیگر الفاظ سے جوڑ اور ربط ہے' جیسے اس آیت میں ہے کہ:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ﴾ (یوسف)

''(یوسف کے بھائی) کہنے لگے (ابا جان) اللہ کی قسم یوسف کو ہی یاد کرتے کرتے آپ مضمحل ہو جائیں یا مر جائیں گے۔''

آیت مذکورہ میں 'تَاللّٰهِ'' کی تاء قسم کے استعمال کے لیے غریب ترین ہے۔ ''تَفْتَؤُا'' کا استمرار کے لیے افعال ناقصہ میں استعمال بھی غریب ترین ہے۔ '' حَرَضًا'' کا ہلاکت کے لیے استعمال بھی غریب ہے۔ یہاں پے در پے غریب الفاظ کا استعمال ایک انوکھا ربط قائم کیے ہوئے ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی حالت کی عکاسی میں عجب اضافے کا سبب ہے۔ (۲۰)

الفاظ کے معنی کی مناسبت کا مطلب الفاظ کا ماقبل یا مابعد سے معنوی طور پر جڑنا ہے۔ جیسے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ﴾ (الانعام:۱۵۱)

''اور تم اپنی اولاد کو افلاس کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی (دیں گے)''۔

دوسری آیت مبارکہ میں ہے کہ:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ﴾ (الاسراء:۳۱)

''اور تم اپنی اولاد کو غریب ہو جانے کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی اور تم کو بھی رزق دیتے ہیں۔''

سورۃ الانعام کی آیت میں آباء کو رزق دینے کا تذکرہ ابناء کو رزق دینے سے پہلے کیا گیا ہے' جبکہ دوسری آیت جو سورۂ اسراء کی ہے' اس میں اولاد کو رزق دینے کا ذکر والدین کو رزق دینے سے پہلے کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں مخاطبین فقراء ہیں جو اپنی اولادوں کو بھوک پیاس کی وجہ سے قتل کر دیتے تھے' تو انہیں کہا جا رہا ہے کہ اس غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل نہ کرو' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی دیں گے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہیں آج تک کون دیتا آ رہا ہے؟ وہی اب

تمہیں بھی دے گا اور انہیں بھی!

دوسری آیت میں مخاطبین فقراء کے علاوہ اغنیاء قسم کے لوگ ہیں جو اپنی اولادوں کو غریب ہو جانے کے ڈر سے قتل کر دیتے تھے' تو انہیں کہا جا رہا ہے کہ تم غریب ہونے کے ڈر سے انہیں قتل نہ کرو' اللہ انہیں بھی دینے والا ہے اور تمہیں بھی۔

یہاں دونوں آیات میں رزق دینے کی تقدیم وتأخیر ماقبل کے اجزاء سے خوب مناسبت پیدا کر رہی ہے۔(۲۱)

آیات کے اجزاء کی مناسبت

بعض آیات تو ایک ایک جزو پر مشتمل ہوتی ہیں اور بعض کئی اجزاء اور فواصل پر۔ ان اجزاء اور فواصل کا بھی سیاق سے تعبیراً اور معناً ربط ہوتا ہے۔ جیسے آیاتِ کریمہ:

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ (ابراھیم)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرو تو تم ان کا احصاء نہ کر پاؤ گے۔ بے شک انسان بے حد ظالم اور ناشکرا ہے۔''

اور

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (النحل)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے' بے شک اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

مذکورہ دونوں آیات کا خاتمہ مختلف انداز سے ہو رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ آیت ماقبل سے مربوط ہے بلکہ ماقبل مضمون کا بھی تقاضا ہے کہ آیت کا فاصلہ اس کے مطابق لایا جائے۔ ذرا سا غور کیا جائے تو سورۂ ابراہیم کی آیت اور اس کا فاصلہ ماقبل سے اس طرح مربوط ہے کہ ماقبل عبارت میں انسان اور اس کی صفات کا تذکرہ ہے' اس لیے اس آیت کا اختتام بھی انسان کے اوصاف پر کیا گیا۔ اور دوسری سورۃ النحل کی آیت میں اللہ رب العزت کی صفات کے سیاق میں اس آیت کریمہ کو لایا گیا' اس لیے اس کا خاتمہ صفاتِ باری تعالیٰ پر کیا گیا۔(۲۲)

آیات کے مابین نظم ومناسبت

آیات میں نظم ومناسبت کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

(۱) نظم ظاہر (۲) نظم غامض

پہلی قسم: نظم ظاہر

کسی آیت کا دوسری آیت سے بغیر گہرے غور وخوض سے حاصل ہونے والا ظاہری ربط 'نظم ظاہر' ہے۔ اس صورت میں ایک آیت ماقبل آیت کا یا تو اعتراض ہوگی یا بدل' مؤکد ہوگی یا مفسر (۲۳) یا کسی دوسرے ظاہری انداز سے مربوط ہوگی۔ نظم کی اس قسم کے بارے میں امام سیوطی کا کہنا ہے:

" لَا كَلَامَ فِيْهِ " (۲۴)

یعنی اس قسم میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ یہ کلام کا حصہ ہی ہوتا ہے جس کے بعض اجزاء مکمل طور پر بعض سے متعلق ہوتے ہیں یا جزوی طور پر۔ نیز اس میں ربط واضح ہی ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) کسی آیت کا ماقبل آیت کے لیے سبب ہونا' جیسے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝﴾ (آل عمران)

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں الکتاب سے کچھ حصہ دیا گیا (اور جب) انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان (اس سے) فیصلہ کیا جائے تو ان میں سے ایک گروہ اعراض کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہمیں تو آگ نہیں چھوئے گی مگر تھوڑے ہی دن۔ اور ان کو ان کے دین میں گھڑے گئے جھوٹوں نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے''۔

یہاں پہلی آیت میں کتاب اللہ سے ان کے اعراض کا سبب دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ یعنی اہل کتاب سمجھتے تھے کہ انہیں آگ نہیں چھوئے گی اور اگر چھوئے گی بھی تو چند دن کے لیے۔

(۲) دوسری آیت کا پہلی کی تفسیر ہونا' یعنی ماقبل آیت میں پائے جانے والے اجمال کی تفسیر ہو' جیسے درج ذیل آیات میں ہے:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾﴾ (المعارج)

''بے شک انسان بے صبرا ہے' کہ جب اسے مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے' اور جب اسے دولت ملتی ہے تو بخیل ہو جاتا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں ''هَلُوْعًا'' کے لفظ میں پایا جانے والا اجمال اگلی دونوں آیات میں کھولا جا رہا ہے کہ انسان کی بے صبری یہ ہے کہ تنگ حالات میں جزع وفزع کرنے لگتا ہے اور فراخی والے حالات میں بخیل ہو جاتا ہے۔ یہ انداز بھی ظاہری نظم کی ایک قسم ہے۔

(۳) دوسری آیت پہلی آیت کی تاکید ہو' جیسے:

﴿وَيٰقَوْمِ مَا لِيْ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ (المؤمن: ۴۱'۴۲)

''اے میری قوم! کیا بات ہے کہ میں تمہیں جہنم سے چھڑانا چاہتا ہوں اور تم مجھے اس کی طرف بلا رہے ہو؟ تم مجھے بلاتے ہو تا کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں اس چیز کو جسے میں جانتا نہیں''۔

ان دو آیات سے ماقبل کی آیات میں یٰقَوْمِ..... کے لفظ سے خطاب کیا گیا تھا' یہاں پھر یٰقَوْمِ کی تکرار پہلے والی آیات کی تاکید ہے۔[۲۵]

اسی آیت میں دوسری تاکید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلی آیت میں فرمایا: ﴿تَدْعُوْنَنِيْ اِلَى النَّارِ﴾ اور دوسری آیت میں اس کی تاکید ہے کہ ﴿تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ.....﴾ یعنی ان کا آگ کی طرف بلانا اور اللہ کے ساتھ کفر وشرک کی طرف پکارنا گویا آگ کی طرف بلانے کی تاکید ہے۔

(۴) دوسری آیت پہلی آیت کا بدل ہو' جیسے سورۃ الفاتحہ میں فرمایا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۶﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

یہاں پہلی آیت میں لفظ صراط کا بدل اگلی آیت میں موجود ہے جو ماقبل صراط کا مبیّن بھی ہے۔ یہ اسلوب بھی نظم ظاہر کی ہی ایک قسم ہے۔

(۵) آیت معترضہ ہو' جیسے:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ

كَرِيۡمٌ﴿۷۷﴾ (الواقعة)

''ستارے جہاں ڈوبتے ہیں میں اس کی قسم اٹھاتا ہوں' تمہیں علم ہو جائے تو یہ بہت بڑی قسم ہے' بے شک یہ عزت والا قرآن ہے''۔

یہاں یہ بتانا کہ یہ بڑی قسم ہے جملہ معترضہ ہے جو درمیان والی آیت ہے اور پھر درمیان والی آیت میں ''لَوْ تَعْلَمُوْنَ'' بھی معترضہ ہے۔ کسی بھی کلام میں جملہ معترضہ لانا کلام کے اسالیب نظم کی ہی قسم ہوتی ہے۔

(۶) دوسری آیت مستثنیٰ ہو: ظاہری ربط کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جو حکم پہلی آیت میں ثابت کیا جا رہا ہے اگلی آیت میں اس سے استثناء موجود ہو' جیسے:

﴿سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (الاعلیٰ:۷)

''ہم آپ کو (اچھی طرح قرآن) پڑھا دیں گے پھر آپ نہ بھولیں گے' سوائے اس کے جو اللہ چاہے''۔

یہاں بعد والی آیت میں فَلَا تَنۡسٰۤى سے استثناء ظاہر و باہر ہے۔

(۷) شرط اور جواب شرط کا ربط: فرمایا:

﴿فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ ؕ﴾

(التوبة:۱۱)

''پس اگر وہ تائب ہو جائیں اور نماز قائم کرنے لگ جائیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں''۔

گویا کفار کو دینی بھائی بنانے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ تائب ہو جائیں' نماز قائم کر لیں اور زکوٰۃ ادا کرنی شروع کر دیں۔

(۸) غایت' مغیا کا ربط: بسا اوقات پہلے ایک بات کر کے پھر اس کی غایت بتائی جاتی ہے' جیسے:

﴿لَا يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الۡجَمَلُ فِىۡ سَمِّ الۡخِيَاطِ ؕ﴾ (الاعراف:۴۰)

''وہ جنت میں نہ جائیں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے۔''

یعنی ان کے جنت میں داخلے کی غایت یہ ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزرے۔

اس طرح ظاہری ربط کی اور بھی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں' یہاں سب کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

دوسری قسم: نظم غامض

آیات کے مابین ایسا ربط جو نہ تو ظاہر ہو اور نہ ہی لفظوں سے کھل کر واضح ہو رہا ہو' بلکہ معنوی اور تعبیری طور پر حاصل ہو آیات کا نظم غامض کہلاتا ہے۔

قرآن مجید میں اکثر یہ اسلوب اپنایا گیا ہے کہ جب احکام ذکر کیے جاتے ہیں تو ان کے بعد جزاء وسزا کا بیان ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو عمل پر ابھارا جا سکے۔ پھر توحید اور تسبیح وتنزیہہ کی آیات لائی جاتی ہیں تاکہ اوامر ونواہی کی عظمت جانی جائے' اگرچہ ظاہر میں ہر آیت مستقل اور مکمل طور پر علیحدہ نظر آتی ہے۔(۲۶)

نظم کی اس قسم کے بارے میں علماء کا اختلاف واقع ہوا ہے اور قائلینِ نظم بھی اپنی اپنی تعبیرات میں مختلف نظر آتے ہیں' کیونکہ نظم کی اس قسم کا تعلق خالصتاً انسانی کاوش اور مذاق سے ہے اور انسانی کاوش میں ہمیشہ سے اصابت وخطا کا احتمال رہا ہے۔

نظم کی اس قسم کی بنیادی طور پر دو مزید اقسام ہیں:

(۱) دوسری آیت ماقبل آیت پر معطوف ہوگی۔

(۲) دوسری آیت ماقبل آیت پر معطوف نہ ہوگی۔

(۱) اگر معطوف ہے: اگر دوسری آیت ماقبل پر حروفِ عاطفہ میں سے کسی حرف کے ساتھ معطوف ہے تو اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو معطوف علیہ کا ہے' جیسا کہ عطف میں ہوتا ہے۔ نیز ان کے درمیان جمع کرنے والی کوئی صورت بھی ہو' جیسے تضاد۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ﴾ (البقرۃ:۲۴۵)

''اور اللہ ہی روزی تنگ کرتا اور کھولتا ہے''۔

اس کی مثالیں دو شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں:

ایک الطباق اور دوسری المقابلہ

☆ الطباق یہ ہے کہ دو متضاد اشیاء کو تقابل کرتے ہوئے اکٹھا کر دیا جائے۔ جیسے سفید و سیاہ' رات دن وغیرہ۔ اس کی مزید دو شکلیں ہیں: لفظی اور معنوی۔

لفظی جیسے:

﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا﴾ (التوبۃ:۸۲)

''پس کم ہنسا اور زیادہ رویا کریں''۔

معنوی جیسے:

﴿قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝﴾ (یٰس)

''وہ کہنے لگے تم تو ہماری طرح کے آدمی ہو اور اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب نہیں اتاری تم تو جھوٹے ہی ہو۔ انہوں نے (جواباً) کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ بیشک ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں (یعنی جھوٹے نہیں سچے ہیں)''۔

اس میں آخری کلمات معنوی تضاد کو واضح کرتے ہیں۔

☆ المقابلہ: دو اشیاء کے مابین ایسی نسبت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بعض صفات میں تو ایک جیسی ہوں اور بعض میں مخالف ہوں' جیسے یہ آیت کریمہ ہے:

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝﴾ (القیامۃ)

یعنی ''نہ سچ بولا نہ نماز پڑھی۔ لیکن جھوٹ کہا اور منہ پھیرا''۔

یہاں سچائی اور کذب کا نماز اور اعراض سے تقابل ہے۔ یعنی نماز اللہ رب العزت کی طرف متوجہ ہونا اور 'تَوَلّٰی'' اللہ تعالیٰ سے منہ پھیرنا' ان کی باہمی نسبت طباق کی ہے۔ (۲۷)

(۲) دوسری آیت کے معطوف نہ ہونے کی صورت میں: اگر دو آیات کے مابین عطف نہ ہو تو ان میں بعض دیگر معنوی ربط ہو سکتے ہیں جیسے تنظیر واستطراد اور حسن تخلص وغیرہ۔

☆ تنظیر یہ ہے کہ کوئی بات بیان کر کے آگے اس کی مثال بیان کر دی جائے۔ امام زرکشی فرماتے ہیں:

فان الحاق النظیر بالنظیر من دأب العقلاء (۲۸)

''ایک نظیر کا دوسری سے الحاق عقلمندوں کی نشانی ہے''۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿وَقُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ ۝ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِیْنَ ۝﴾ (الحجر)

''اور کہہ دیجیے بے شک میں واضح خبردار کرنے والا ہوں (عذاب الٰہی سے) جیسا کہ ہم نے قسمیں اٹھانے والوں پر اتارا''۔

پہلے یہ بتایا کہ میں اللہ کے عذاب سے خبردار کرنے والا ہوں' پھر اس عذاب میں سے ایک قسم بیان کر دی کہ جیسے کہ مقتسمین پر عذاب اتارا تھا۔

طرف روئے سخن پھرا اور پھر اس سے اللہ کے نورِ ہدایت کے انعامات کی طرف مضمون پھیرا گیا۔(۳۱)

☆ استطراد اور حسن تخلص میں فرق

''امام سیوطی بعض لوگوں کے حوالے سے تخلص اور استطراد میں یہ فرق بیان کرتے ہیں کہ تخلص یہ ہے کہ آپ جو بات کر رہے ہیں اسے بالکل چھوڑ دیں اور مکمل طور پر اس بات کی طرف پھر جائیں جس طرف آپ نے تخلص کیا' جبکہ استطراد یہ ہے کہ آپ کسی مضمون سے اچانک دوسری بات کی طرف پھر کر واپس اسی پر آ جائیں جو پہلے کی جا رہی ہے۔ گویا درمیان والی بات آپ کا مقصود تھا ہی نہیں''۔(۳۲)

آیات میں ربط کی اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن اس مختصر مضمون میں ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی سورتوں کے درمیان ربط

جس طرح سورتوں کے اندر آیات کے مابین ربط ہوتا ہے اسی طرح سورتوں کا بھی باہمی ربط ہوتا ہے۔ سورتوں کے مابین یہ مناسبت کئی انداز سے سامنے آتی ہے' مثلاً:

(۱) سورتوں کے آغاز کا اختتام سے ربط

(۲) آغاز سور کا ماقبل سورتوں کے اختتام سے ربط

(۳) سورتوں کے افتتاح کا باہمی ربط

(۱) سورتوں کے فواتح (آغاز) کا خواتم سے ربط

جیسے کہ سورۃ القصص کے آغاز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے علاقے کی طرف واپس لوٹانے کا وعدہ کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ مجرموں کے دوست نہ بن جائیے۔ اور پھر سورۃ کا اختتام نبی اکرم ﷺ سے اس وعدے پر کیا گیا کہ آپ کو بھی اللہ تعالیٰ وہاں ضرور لوٹا دیں گے جہاں سے آپ کو نکالا گیا یعنی مکہ سے۔ فرمایا گیا:

﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ﴾ (القصص:۸۵)

''بے شک وہ ذات جس نے آپ پر قرآن اتارا ہے' وہ آپ کو پہلے (مکہ) والی جگہ لوٹا دے گا۔''

اور پھر وہی بات فرمائی جو شروع میں فرمائی تھی کہ:

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ (القصص)

''آپ کافروں کے دوست نہ بن جائیے''۔

☆ سورۃ المؤمنون کے شروع میں فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (المؤمنون)

''بلاشبہ ایمان والے فلاح پا گئے''۔

اور آخر میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ﴾

''بے شک وہ کافر فلاح نہیں پا سکیں گے''۔

دونوں آیات میں نظم واضح ہے۔

☆ سورۂ ص کے آغاز میں فرمایا:

﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ (صٓ)

''صٓ، قسم ہے نصیحت والے قرآن کی''۔

آخر میں فرمایا:

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (صٓ)

''قرآن تو سارے جہان (کے لوگوں) کے لیے نصیحت ہی ہے۔''

☆ سورۃ القلم کے شروع میں نبی اکرم ﷺ کی نسبت عارضۂ جنون کی نفی کی گئی کہ:

﴿مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (القلم)

''اللہ کے فضل سے آپ مجنون نہیں ہیں''۔

گویا آخر میں نقل کی گئی مشرکین کی ہرزہ سرائی کا جواب سے پہلے ہی دے دیا گیا۔ آخر سورۃ میں ہے:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ﴾

''وہ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) نبی مکرم مجنون ہے۔''

سورتوں کے فواتح کا ماقبل سورتوں کے خواتم سے ربط

پہلے وضاحت پھر مثال: جیسے سورۃ الواقعہ کے آخر میں فرمایا:

﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾

''تم اپنے عظیم ربّ کے نام سے تسبیح بیان کرو''۔

اور سورۃ الحدید کے شروع میں فرمایا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الحدید:۱)

''آسمانوں اور زمین کی ہر شے اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے''۔

اسی طرح سورۃ الفیل میں قریش پر انعام کا ذکر ہوا کہ ان کے دشمن کو نیست و نابود کر دیا گیا اور سورۂ قریش میں فرمایا گیا:

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ﴾

''انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے ربّ کی عبادت کریں''۔

یعنی ان تمام انعامات کے عوض ان کو اس گھر کے حقیقی مالک کا عبادت گزار بن جانا چاہیے۔

☆ سورۃ الطور کے آخر میں فرمایا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾

''رات کو اور ستاروں کے (غروب ہو) جاتے وقت اللہ کی پاکی بیان کرو''۔

اور سورۃ النجم کے شروع میں فرمایا:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى﴾

''قسم ہے ستاروں کی جب وہ (غروب ہونے کے لیے) جھکیں''۔

ان تمام مثالوں میں نظم و ربط عیاں ہے۔

سورتوں کے فواتح کا باہمی ربط

بسا اوقات ایک سورۂ مبارکہ جن کلمات سے شروع ہو رہی ہوتی ہے ان کا اگلی سورۃ کے ابتدائی کلمات سے ایک خاص ربط ہوتا ہے' جیسے سورۃ الاسراء کا آغاز ان الفاظ سے ہو رہا ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ .....﴾ (الاسراء:۱)

اور اگلی سورۃ' سورۃ الکہف کا آغاز اس طرح ہو رہا ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ .....﴾ (الکہف:۱)

یہاں دونوں سورتوں کے فواتح میں کئی طرح سے ربط ہو سکتا ہے' مثلاً یہ کہ تسبیح' تحمید پر مقدم ہوتی ہے' جیسے کہا جاتا ہے کہ:

سُبْحَانَ اللّٰهِ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ .....(۳۳)

اور دوسرا ربط وہ جو امام زرکشی نے شیخ کمال الدین الزملکانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ سورۃ الاسراء کے شروع میں جو نبی اکرم ﷺ کا خرق عادت معجزہ یعنی واقعۂ معراج بتایا گیا ہے کفار اور مشرکین نے اس کا انکار کیا اور نبی مکرم ﷺ کا انکار اللہ رب العزت کا بالواسطہ انکار ہے' اس لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو افترا بازی سے منزہ قرار دے کر اس معجزے کو بیان کیا گیا ہے۔

اور سورۃ الکہف میں مشرکین کے سوالوں کے جواب میں کچھ دیر بعد آئی تو اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے نبیؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا' بلکہ اس پر وحی اتارتا ہے اور اپنے نبیؐ کو سچا کر دکھاتا ہے۔ (جاری ہے)

حواشی

(۱) قاسمی کیرانوی' وحید الزماں : القاموس الوحید' ص ۱۶۶۹۔

(۲) فیروز اللغات اردو جدید' ص ۶۸۳۔

(۳) معجم الوسیط' باب النون۔

(٤) قاسمی کیرانوی' وحید الزماں : القاموس الوحید' ص ۱۶۳۹۔

(٥) فیروز اللغات (اردو جدید)' ص ۶۵۳۔

(٦) ابن فارس' احمد : معجم مقاییس اللغۃ' ج٥'ص ٤۲۳' ٤۲٤۔

(۷) ابن منظور' جمال الدین محمد بن مکرم الانصاری : لسان العرب' ج١٤'ص١١٩۔

(۸) مناع القطان : مباحث فی العلوم القرآن' ص ۹۷۔

(۹) سیوطی' جلال الدین عبدالرحمٰن : الاتقان فی علوم القرآن' الجزء الثانی' ص ۱۰۸۔

(۱۰) البقاعی' ابراھیم بن عمر : نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور' جلد اول' ص ٦۔

(۱۱) ابن العربی' قاضی ابوبکر : سراج المریدین' بحوالہ الاتقان لسیوطی' ترجمہ: مولانا محمد حلیم انصاری' ص ۳۲٥۔

(۱۲) الزرکشی' محمد بن عبد اللّٰہ' بدر الدین : البرھان فی علوم القرآن' جلد۱' ص ۳' محقق نسخہ' ص ۱۳۱۔

(۱۳) فھد فلاحی' عبیداللہ : قرآن کریم میں نظم و مناسبت' ص ۱۷۔

(١٤) اصلاحی' امین احسن' مولانا : مقدمہ تدبر قرآن' ص ۱۷۔

(۱٥) سیوطی' جلال الدین' عبدالرحمٰن : الاتقان فی علوم القرآن' الجزء الثانی' ص ۱۰۸۔

(۱٦) سنن الترمذی' باب ما جاء فی فضل القرآن' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللهﷺ' ح۲۸۳۱۔
(۱۷) ابن العربی 'ابو بکر' القاضی : "سراج المریدین" بحوالہ زرکشی۔ بدر الدین' محمد بن عبد الله : البرهان فی علوم القرآن' ج۱' ص ۳۷۔
(۱۸) اصلاحی' امین احسن : مقدمہ تدبر قرآن' ص ۲٤۔
(۱۹) فراهی' حمید الدین' مقدمہ نظام القرآن' مجموعہ تفاسیر فراهی' مترجم' ص ٤۹۔
(۲۰) عطا حسن' سامی' دکتور : المناسبات بین الآیات والسور...... ص ۱۳۔
(۲۱) السامرائی' د' فاضل صالح : التعبیر القرآنی ' ص ٦۰'٦۱ بحوالہ عطا حسن سامی' دکتور : المناسبات بین الآیات والسور ...... ص ۱۳
(۲۲) ایضاً' ص ۱۹۷۔
(۲۳) سیوطی' جلال الدین' عبدالرحمٰن : الاتقان فی علوم القرآن' الجزء الثانی' ص ۱۰۸۔
(۲٤) سیوطی' جلال الدین' عبدالرحمن : الاتقان فی علوم القرآن' الجزء الثانی' ص ۱۰۸۔
(۲۵) آلوسی' شهاب الدین السید محمود : روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی' ج۱' ص ۲۷۔
(۲٦) سیوطی' جلال الدین' عبدالرحمٰن : الاتقان فی علوم القرآن' الجزء الثانی' ص ۱۰۹۔
(۲۷) الزرکشی' محمد بن عبداللّٰه' بدر الدین ' البرهان فی علوم القرآن' ج۳' ص۵۱۵'۵۱٦۔
(۲۸) الزرکشی' محمد بن عبدالله' بدر الدین : البرهان فی علوم القرآن' ص ۱٤۳۔
(۲۹) الزرکشی' محمد بن عبدالله' بدر الدین : البرهان فی علوم القرآن' ج۱' ص ٤۱۔
(۳۰) الزرکشی' محمد بن عبدالله' بدر الدین : البرهان فی علوم القرآن' ج۱' ص ٤۳۔
(۳۱) الزرکشی' محمد بن عبدالله' بدر الدین : البرهان فی علوم القرآن' ج۱' ص ٤۳۔
(۳۲) سیوطی' جلال الدین' عبدالرحمن : الاتقان فی علوم القرآن' الجزء الثانی' ص ۱۱۰۔
(۳۳) الزرکشی' محمد بن عبدالله' بدر الدین : البرهان فی علوم القرآن' ج۱' ص ۳۹۔

ضروری اطلاع

گزشتہ شمارے میں ذکری جدید نئی دہلی (اسلام کا خاندانی نظام نمبر) کے تعارف میں بتایا گیا تھا کہ یہ خصوصی شمارہ ہمارے پاس محدود تعداد میں موجود ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں کہ اس کا سٹاک اب ختم ہو چکا ہے لہٰذا خواہش مند حضرات متعلقہ ایڈریس پر براہِ راست رابطہ کریں۔

- میڈیا کے نامور سکالر جاوید احمد غامدی کے فکری تفردات اور تجدد پسندانہ نظریات کا علمی و تحقیقی تجزیہ
- جاوید احمد غامدی کے پیش کردہ روشن خیال تصورِ اسلام کا قرآن وسنت کی روشنی میں علمی محاکمہ
- جاوید احمد غامدی کے متجددانہ نظریات پر منفرد اور مستند کتاب

فکرِ غامدی

ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

تالیف:

حافظ محمد زبیر

حافظ طاہر اسلام عسکری

شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور

- معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ
- اعلیٰ سفید کاغذ
- عمدہ طباعت
- صفحات: 128
- قیمت: 70 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خدام القرآن لاہور**

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-5869501

email : maktaba@tanzeem.org

website : **www.tanzeem.org**